ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

نومبر ۲۰۱۵ء

شمع روشن بجھ گئی، بزم غیاث ماتم میں ہے۔

بانی ادارہ کا سانحۂ ارتحال

Rs. 20:00

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔		قطعۂ تاریخ وفات (ڈاکٹر محمد غیاث صدیقیؒ)	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
۲۔	تعزیتی خطوط		مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ۳
۳۔	// //		ڈاکٹر سید سلمان ندوی ۴
۴۔	// //		مولانا الیاس ندوی بھٹکلی ۵
۵۔	اداریہ	اخلاص کے پیکر اور مجسمہ اخلاق ڈاکٹر محمد غیاث.....	مدیر ۶
۶۔	ماضی کی یادیں	ماضی کی یادوں سے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۱۶
۷۔	گوشۂ سیرت	نیا اسلامی سال، واقعۂ ہجرت اور ہم	محمد فرید حبیب ندوی ۱۸
۸۔	بانئ ادارہ کی رحلت	مولانا سید سلمان حسینی ندوی کا تعزیتی خطاب	پیش کش: محمد فرید حبیب ندوی ۱۹
۹۔	// //	مولانا سید بلال حسنی ندوی کا تعزیتی خطاب	تلخیص: ابوطلحہ ندوی ۳۱
۱۰۔	// //	شمع روشن بجھ گئی، بزم غیاث ماتم میں ہے	عمیر الصدیق ندوی دریابادی ۳۳
۱۱۔	// //	جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں	اشہد جمال ندوی ۳۵
۱۲۔	// //	ڈاکٹر محمد غیاث-یادیں اور نقوش	محمود حسن حسنی ندوی ۳۶
۱۳۔	// //	عشق سیہ پوش ہوا	پروفیسر ابوسفیان اصلاحی ۴۱
۱۴۔	// //	کوئی محفل ہو، تیرا رنگ محفل یاد آتا ہے	محمد غزالی ندوی ۴۵
۱۵۔	// //	میرے مربی ومحسن- کچھ یادیں، کچھ باتیں	محمد اسماعیل سہسوانی ۴۷
۱۶۔	// //	ہم نے ایسے بھی زمانے میں قلندر دیکھے	محمد قمر الزماں ندوی ۵۱
۱۷۔	// //	ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم	محمد فرید حبیب ندوی ۵۴
۱۸۔	// //	مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے	محمد عالم مرادآبادی ۵۷
۱۹۔	مرحوم کی یادوں سے	ڈاکٹر محمد غیاث صاحب مرحوم کا ایک خطاب	پیش کش: حسن عمار ۵۸
۲۰۔	خاص تحریر	بابری سے دادری تک	پروفیسر محسن عثمانی ندوی ۵۹
۲۱۔	آخری صفحہ	ایک اور ستارہ روپوش ہوا	م۔ق۔ن ۶۴
۲۲۔	نذرانۂ عقیدت	(غیاث ندویؒ)	قمر لکھنوی

❋❋❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

تعزیتی خط: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

عزیز مکرم ڈاکٹر سعد فرزند ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے والد صاحب کی رحلت کی خبر نے دل پر بہت اثر ڈالا، ان سے جو تعلق رہا ہے اور وہ جس طرح تعلق رکھتے تھے اس کی بناء پر ان کی اس دنیائے فانی سے رحلت ان سے محبت کرنے والوں کے لئے بڑا سانحہ ہے ان کے لئے رحمت ومغفرت کی دعا کے علاوہ ان کے تعلق والوں کے لئے اظہار تعلق کا دوسرا ذریعہ نہیں اور اب وہی ان کے لئے ترقی درجات کا ان شاء اللہ ذریعہ ہے، اس جہان فانی سے جہان باقی کی طرف منتقلی سب کی ہوتی رہی ہے اور سب کی ہی ہوتی رہے گی اور یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے مقدر ہوتی ہے، اس لئے اس کی طرف سے صبر ورضا بالقضاء اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کو بتایا گیا ہے۔ اور اس میں رحلت کرنے والے کا فائدہ بتایا گیا ہے اور رخصت کرنے والوں کی تسکین کا ذریعہ ہے۔

ڈاکٹر غیاث صاحب نے نیک کاموں اور رضاء الٰہی کی طلب کے جذبہ میں اپنی زندگی گذاری جس کا فائدہ ان کو اب مل رہا ہوگا، انہوں نے اپنے نیک کاموں سے دوسروں کے لئے اچھا نمونہ چھوڑا، وہ جو اپنی دعوت و تربیت کا کام شروع کر گئے وہ جب تک ہوتے رہیں گے ان کو صدقہ جاریہ کا ثواب ملتا رہے گا۔

اب آپ اور آپ کے بھائیوں پر اسی کام کو قائم رکھنے کی ذمہ داری آ گئی ہے اور امید ہے کہ آپ اس کو بخوشی جاری رکھیں گے، ہم کو ان سے جو تعلق رہا ہے انشاء اللہ وہ آپ حضرات کے ساتھ رہے گا، آپ اور آپ کے بھائیوں کے لئے دعاء بھی رہے گی۔

میری طرف سے دلی تعزیت قبول کیجئے اور اپنی والدہ صاحبہ اور اپنے بھائیوں کو بھی پہونچایئے، میں اس موقع پر میرا دل بہت چاہ رہا ہے کہ پہنچوں لیکن صحت کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے عمل نہ کر سکا، میرے عزیز میری طرف سے نمائندگی کر رہے ہیں، امید ہے کہ یہ کافی ہوگا۔

والسلام

دعا گو

محمد رابع حسنی ندوی

۹/اکتوبر ۲۰۱۵ء

برادر عزیز مولانا واضح رشید کی طرف سے بھی یہی اظہار تعزیت ہے۔

تعزیتی پیغام: پروفیسر سید سلمان ندوی (ساؤتھ افریقہ)

Zafrul Islam sahib: Assalamu Alaikum. Received the painful news of the passing away of Ghayas sahib. INNA LILLAH... I liked him very much and respected him for his sincerity and upright character. To establish an educational institution in Aligarh with complete trust in Allah was not and is not an easy task. I knew that the illness which struck him will not let him live for long. May Allah place him in the highest status in Jannah. Please do convey my sincere Ta'ziat to his family and also to the Madrasah teachers. It is indeed a blow. I hope the staff will follow his example and keep turning to Allah for the success of the project he had started. I am presently in Pakistan. I plan to visit India either in December or Marc

ظفر الاسلام صاحب، السلام علیکم

ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی صاحب کے دنیا سے رخصت ہونے کی تکلیف دہ خبر ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں انہیں بہت زیادہ پسند کرتا تھا، اور ان کے پر خلوص اور اچھے کردار کی وجہ سے ان کی عزت بھی کرتا تھا، انہوں نے مکمل اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے، علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا، جو کہ آسان کام نہیں تھا یا نہیں ہوتا ہے، میں جانتا تھا کہ جو بیماری ان کو لاحق ہوئی تھی، ان کو زیادہ دن تک زندہ نہیں رہنے دے گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم ڈاکٹر غیاث صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، برائے مہربانی میرا یہ مخلصانہ تعزیتی پیغام آپ مرحوم کے اہل خانہ کو اور مدرسہ کے تمام اساتذہ کو پہونچا دیجئے۔ اس لئے کہ یقیناً یہ ایک اندوہناک خبر ہے، مجھے پورے اسٹاف سے امید ہے کہ جس مشن کو ڈاکٹر صاحب نے شروع کیا تھا اس کو آگے بڑھانے کے لئے مثالی طریقہ کار کو اختیار کریں گے اور اس کی کامیابی و کامرانی کے لئے اللہ رب العزت سے دعا گو رہیں گے، میں فی الحال پاکستان میں ہوں، انشاء اللہ دسمبر یا مارچ میں ہندوستان آنے کی امید ہے۔

☆☆☆

تعزیتی خط: مولانا الیاس ندوی بھٹکلی

صدیق مکرم مولانا ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب ندوی زید لطفہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

عرض خدمت کہ محترم المقام جناب ڈاکٹر غیاث صاحب ندوی کے اچانک سانحہ ارتحال کی اطلاع یہاں بھٹکل میں ہم سب ان سے تعلق رکھنے والوں پر بجلی بن کر گری۔إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

جمعہ کے دن شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں جہاں بالعموم پانچ ہزار سے زائد مصلین رہتے ہیں مرحوم کی نماز غائبانہ بھی ادا کی گئی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم علی گڑھ میں ندوۃ العلماء کی فکر کے ترجمان اور اس کے داعی ونمائندہ تھے، اپنے مادر علمی اور اس کے بزرگوں بالخصوص مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ اور مخدومی حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ العالی سے ان کو جو والہانہ تعلق تھا اس کا اندازہ عام لوگوں کو نہیں ہوسکتا، میں اس کا عینی شاہد ہوں، دوسال قبل مفکر اسلام پر علی گڑھ میں اپنے ادارہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر صاحب جو عالمی سمینار کرنے جارہے تھے اس میں حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب کی شرکت ناسازی طبع کی وجہ سے یقینی نہیں تھی، انھوں نے مجھے فون کیا اور بچوں کی طرح روتے ہوئے مجھے یہ ذمہ داری دی کہ میں کسی طرح حضرت مولانا دامت برکاتہم کو کچھ دیر کے لیے ہی سہی علی گڑھ سمینار میں شرکت پر آمادہ کروں، اس کے بعد وہ خود اپنی سخت علالت وبیماری کے باوجود ٹرین سے ٹکٹ نہ ملنے کے باوجود بذریعہ کار علی گڑھ سے رائے بریلی پہنچ گئے۔

چھوٹوں پر ان کی شفقت اور ان کی حوصلہ افزائی سننے سے نہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھے، اپنے اخلاق کریمانہ، تواضع وخاکساری اور سب سے بڑھ کر دینی تڑپ، فکرمندی اور دلسوزی نے ان کو اپنے تمام معاصرین میں ممتاز کر دیا تھا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل کی طرف سے انھوں نے علی گڑھ میں متعدد دفعہ اسکولوں وکالجس کے ذمہ داروں کے پروگرام کروائے جس سے ہمیں الحمد للہ اس دعوتی وتعلیمی کارواں کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد ملی، میں ان کے ان عظیم احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

اہالیان بھٹکل اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب اکیڈمی سے ان کو خصوصی تعلق تھا، اس کی دعوت پر وہ کئی دفعہ بھٹکل آئے اور ہمیشہ یہاں کے علماء کو اپنا گرویدہ بنا کر گئے، اب رہ رہ کر ان کی خوبیاں اور محاسن یاد آرہے ہیں۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

اب آپ حضرات پر ان کی نیابت کے فرائض عائد ہوئے ہیں، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ آپ بھی ان کے شروع کیے ہوئے اس دینی مشن اور اس تعلیمی ودینی قافلہ کو اسی جذبہ وحسن نظم کے ساتھ آگے بڑھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرما کر ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

شریک غم

محمد الیاس ندوی بھٹکلی

جنرل سکریٹری مولانا ابوالحسن علی ندوی

اسلامک اکیڈمی، بھٹکل

اداریہ

إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

سب کھوکے تیری راہ میں دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

اخلاص کے پیکر اور مجسمۂ اخلاق ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی کا سانحۂ ارتحال

امیر شریعت مولانا سید نظام الدین کا سانحۂ وفات

ابھی محترم ڈاکٹر غیاث صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا غم ہلکا بھی نہ ہوا تھا اور اشکوں کا سلسلہ تھمنے بھی نہ پایا تھا کہ اسی دوران مولانا سید نظام الدین صاحبؒ (امیر امارت شرعیہ، بہار) کی رحلت کا حادثہ پیش آ گیا۔ چند دن آگے پیچھے ملت کے ان دو سپوتوں کی موت نے پوری ملت ہلا کر رکھ دیا۔

رسالہ تیار ہو چکا تھا اور مضامین بھی مرتب ہو چکے تھے، بس پریس جانے ہی والا تھا کہ یہ حادثۂ فاجعہ پیش آیا، مدیر محترم بھی اس وقت مؤسسۃ القدس کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے ترکی کے سفر پر ہیں، اس وجہ سے مولانا سید نظام الدینؒ پر کوئی مضمون رسالہ میں شائع کرنے کی نوبت نہ آسکی، سر دست بس یہ چند سطریں اظہار غم وتعزیت کے طور پر سپرد قلم کی جا رہی ہیں، بلکہ تعزیت بھی کس سے کی جائے اور کیوں کی جائے؟ تعزیت کے تو ہم خود مستحق ہیں، کہ مولانا مرحوم کی وفات صرف ان کے اعزہ واقارب اور اصحاب ورفقاء کے لئے ہی باعث رنج والم نہیں، بلکہ ہم سب کے لئے اور پوری امت کے لئے بھی تکلیف دہ ہے، اس لئے تعزیت کے حقدار تو ہم خود ہیں۔

مولانا سید نظام الدینؒ نے اپنی پوری زندگی دین وملت کی سربلندی کی خاطر قربان کردی، آپ کے زہد کا یہ عالم تھا کہ اپنی رہائش کے لئے کوئی ذاتی مکان بھی نہ تھا، امت کو درپیش بہت سے مسائل میں آپ نے گراں قدر خدمت انجام دیں، آپ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری، امارت شریعہ بہار کے امیر، اور دارالعلوم دیوبند وندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن تھے، اس کے علاوہ متعدد تعلیمی ورفاہی ادارے آپ کی سرپرستی میں اپنی خدمت انجام دے رہے تھے۔

آپ کی وفات سے ملت کا ایک اور غمخوار وغمگسار بلکہ انسانیت کا خادم اٹھ گیا، آپ کی وفات سے پورے ملک میں ایک خلا پیدا ہو گیا، امت کے لئے سوچنے اور جینے مرنے والے بچے کھچے افراد میں سے ایک ایک کر کے سب اٹھتے جا رہے ہیں، آہ! اور ان کی جگہ کو پر کرنے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، آپ کی خدمات کو آپ کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے، آپ کے اعزہ واقارب نیز پوری ملت کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کا نعم البدل نصیب فرمائے، ادارہ امت کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ (ادارہ)

مشیت الٰہی ہر خواہش وتمنا پر غالب آتی ہے، جذبات واحساسات اور وسائل قدرت باری کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں، وہی ہوا جس کا دھڑکا لگا تھا، ۶/ اکتوبر بوقت مغرب یہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب رخصت ہو گئے، کسے تاب تھی کہ وہ اس عظیم شخصیت کو صبح ہوتے ہی مٹی کے نیچے دبا دے لیکن حکم الٰہی یہی تھا، ہر کس وناکس تصویر غم بنا ہوا تھا، ہر آنکھ نم تھی، ہر ہونٹ کپکپاتے ہوئے مدح سرا تھا، لوگ کہہ رہے تھے کہ علی گڑھ میں اتنا بڑا جنازہ کسی کا نہ ہوا، کوئی ان کے احسانات گنا رہا تھا تو کوئی حسن سلوک کا تذکرہ کر رہا تھا، کسی کی زبان پر ان کی شرافت نفسی کا ذکر تھا تو کوئی ان کی رعایت ومروت، حمیت وغیرت، دلنوازی وکرم گستری اور حوصلہ افزائی، جذبۂ تعاون وخدمت خلق، للّٰہیت وتڑپ، فنائیت وبے لوثی، احسان شناسی وقدردانی، سخاوت ومہمان نوازی کے واقعات ومشاہدات بیان کر رہا تھا، شاعر نے یوں ہی نہیں کہا ہے کہ ”زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو“ حضور ﷺ کی تصدیق وتائید بھی ہے کہ مسلمانوں کو حق کے گواہ کی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ وہ اگر کسی کی تعریف میں رطب اللسان ہوں تو یہ ممدوح کے حق پر ہونے کی

دلیل ہے، یقیناً ہمارے ڈاکٹر صاحب نے حق کی حفاظت، حق کی اشاعت اور حق کی خدمت میں نہ رات کو رات سمجھا اور نہ دن کو دن، نہ صحت کی فکر کی نہ آرام کا خیال، آج اگر لوگ بلاتفریق مذہب ومسلک ومشرب ہر طرح کی عصبیت سے بالا ہو کر انہیں سپرد خاک کرنے آئے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے تو اس میں تعجب کیسا، وہ یقیناً اخباری شہرت کے حامل نہ تھے، بڑی شخصیتوں میں ان کا شمار نہ ہوتا تھا لیکن یہ مشاہدہ ہے اور ایک دو افراد کا نہیں سینکڑوں لوگوں کا ہے کہ وہ مرجع خلائق تھے، اپنی ذات میں انجمن تھے، میں ہی نہیں جانے کتنے احباب وقدرداں وشناسا اور محبت کرنے والوں کی زبان پر اب یہی ہے کہ ؎

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں

آج یہ پہلا موقع ہے جب میرا قلم آنسوؤں کی روشنائی ڈالنے کے باوجود چلنے کو تیار نہیں، رہ رہ کے وہ اور ان کی یادیں کلیجہ چھلنی کرتی ہیں، ان کی نادر وپرکشش ادائیں لحہ بہ لحہ تنہائی کا احساس دلاتی ہیں، سچ پوچھیے تو آج اس ناکارہ کو غم جاناں کا احساس ہو رہا ہے، وہ محسن بھی تھے مربی بھی، رازداں بھی تھے کرم گستر وغمگسار بھی، پیکر حسن اخلاق بھی تھے اور اخلاص کی بیش بہا دولت سے مالا مال بھی، وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی جیتی جاگتی تصویر تھے، انہیں یہ ہنر خوب تھا کہ کس سے کیا بات کرنی ہے، کس حد تک مشورے لینا اور اس پر کتنا عمل کرنا ہے، جس سے ان کا ذرا بھی تعلق ہو جاتا پھر وہ اس کی ہر طرح فکر کرتے، کبھی شفیق باپ کی طرح سوچتے، کبھی دل دردمند رکھنے والے بڑے بھائی کی حیثیت سے مشورے دیتے، ان کی یہ خصوصیت تھی کہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی، جو ان کے پاس بیٹھتا اسے لگتا کہ میں ہی ان کا رازداں اور ان کے سب سے قریب ہوں، خود مجھے کبھی کبھی یہ گمان ہوتا کہ میں ان کے بیٹوں اور بھائیوں سے زیادہ ان کے قریب ہوں، ان کی یہ صفت پر تو تھی اخلاق نبی ﷺ کی، کہ آپ کے پاس آنے والا ہر خاص وعام اپنے کو آپ کے سب سے زیادہ قریب سمجھتا، ہمارے ڈاکٹر صاحب اخلاق ومعاملات میں واقعی بے مثال بلکہ فقید المثال اور نادر الوجود تھے، یوں تو بہت سے لوگ اس دعوی کو صاد کریں گے مگر اس سلسلہ کی سب سے معتبر گواہی عالم اسلام کی ایک مشہور شخصیت مولانا سید سلمان الحسینی دامت برکاتہم کی ہے جنہوں نے متعدد ملکوں کی خاک چھانی ہے اور ہزاروں شخصیات کے نقوش ان کی آنکھوں میں ہیں، فرمانے لگے کہ بہت سے بڑے بڑے لوگوں سے ملا، لیکن کویت کے شیخ نادر النوری اور ڈاکٹر غیاث صاحب جیسے اعلیٰ اخلاق کا حامل کسی تیسرے کو نہ پایا، واقعہ یہی ہے کہ اخلاقیات پر کتابیں لکھنا، تقریریں کرنا تو بہت آسان ہے لیکن اس کو برتنا بہت مشکل ہے، لوگ زیادہ سے زیادہ اپنے اعزہ کے ساتھ برت لیتے ہیں، جس سے انسیت ہو، قلبی لگاؤ ہو یا اس سے کوئی مقصد حاصل کرنا ہو، کوئی شخصیت مشہور ومعروف ہو تو بڑی حد تک لوگ اخلاقیات کا مظاہرہ کر لیتے ہیں، لیکن آہ- ڈاکٹر صاحب! آپ تو چھوٹے سے چھوٹے شخص کے ساتھ بھی اس طرح ملتے اور پیش آتے اور اس کی عزت نفس کا ایسا خیال فرماتے کہ وہ آپ اپنی عزت کرنا سیکھ جاتا، کم ترین لوگوں کو بھی ایسی عزت دیتے کہ وہ اپنے کو پہچاننا شروع کر دیتا، بچے، بڑے، معاصر اور دوست واحباب، مزدور، رکشے والے سب کے ساتھ آپ کا یکساں سلوک، آپ کو یقیناً تعلق مع اللہ کے سبب یہ مقام حاصل ہو گیا تھا کہ لوگ آپ پر فریفتہ تھے، آپ کی مسکراہٹوں سے انہیں سکون ملتا تھا، آج ہماری نظریں آپ کو

.....لیکن آہ- ڈاکٹر صاحب! آپ تو چھوٹے سے چھوٹے شخص کے ساتھ بھی اس طرح ملتے اور پیش آتے اور اس کی عزت نفس کا ایسا خیال فرماتے کہ وہ آپ اپنی عزت کرنا سیکھ جاتا، کم ترین لوگوں کو بھی ایسی عزت دیتے کہ وہ اپنے کو پہچاننا شروع کر دیتا.....

تلاش کررہی ہیں، بس ایسا لگتا ہے کہ ابھی آپ مسکرائے ہوئے داخل ہوں گے، آپ ہی تو تھے جو ہر تحریر (خواہ کسی لائق نہ ہو) پر داد و تحسین دیتے تھے، آپ نے اس قدر اپنائیت کا احساس دلایا کہ ہم واقعی آپ کو اپنا محسوس کرنے لگے تھے، اب آپ ہی رخصت ہوگئے، اب کون فکریں فرمائے گا، کون میری فکروں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمہ تن کوشاں ہوگا، کون مجھے کام کے لئے مہمیز کرے گا، کون خون گرمائے گا اور جذبات ابھارے گا، اب کون ہے جو ہر اقدام وعمل کی ستائش کرے گا اور مستقبل کا لائحہ عمل بنائے گا، آپ تو چھوٹی سی بات پر بھی اس قدر ستائش بے جا کر دیا کرتے تھے کہ کوئی بڑا کام کرنے کا دل چاہنے لگتا تھا، آپ کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ اخلاق کی جس صفت سے متصف کیا تھا وہ نادر الوجود ہے، آپ اپنے کو پیچھے رکھتے تھے اور دوسروں کو آگے بڑھا دیتے تھے، یہ آپ نے ہمیشہ کیا اور ہر ایک کے ساتھ کیا، جو صاحب حس و باغیرت ہوتے تھے وہ ممنون احسان وکرم رہتے تھے اور جو فطرتاً خراب ہوتے تھے وہ استحصال کرتے اور تکلیف پہنچاتے تھے، لیکن واہ رے عظیم انسان-! یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ شخص غلط کر رہا ہے اور استحصال کر رہا ہے آپ اس کی بھی رعایت کرتے تھے، اس طرح خود گھٹنے اور دوسروں کو بڑھانے کی صفت شاعر نے والدین کے لئے بیان کی ہے:

ماں باپ بھی ہیں قدرت کی انوکھی تخلیق
خود تو گھٹتے ہیں بچوں کو بڑھا دیتے ہیں

لیکن میں شاہد ہوں، چشم دید ہوں اور سراپا معترف ہوں کہ یہ صفت ڈاکٹر صاحب میں اپنے بچوں کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی تھی، خود میرے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے، میری خوشی میں ایسے شریک ہوتے تھے کہ مجھے اپنے والد یاد آجایا کرتے تھے، میرا اکرام واحترام ایسے کرتے کہ مجھے اپنے آپ پر شبہ ہونے لگتا، ان کے مخلص ہم نشین نے گواہی دی کہ کبھی آپ کے غائبانہ میں بھی آپ کا تذکرہ کیا تو بڑی عزت کے ساتھ کیا، جب کبھی میرا کوئی علمی یا دعوتی یا سیاسی سفر ہوتا، قریب کا ہو یا طویل المسافت، اس کی پوری فکر کرتے، استفسار فرماتے، کسی تعارف کی آواز کان میں سرپرست کی طرح بے فرماتے، مجھے یاد ہے کہ رابطہ ادب اسلامی کی رمضان میں مصری فوج کی غاصبانہ کارروائی سے اخوانی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا، میرا دعوت نامہ آیا، ان کو دکھایا تو فرمایا آپ سفر کا ارادہ کر لیجئے، اخراجات کی فکر نہ کیجئے، کہ اس میں فاؤنڈیشن اور مدرسے کی علمی وفکری ترقی مضمر ہے، بلکہ اس پر آمادہ تھے کہ میرے ساتھ سعودیہ چلیں، عمرہ کریں اور وہاں سے موتمر میں جائیں، لیکن تقدیر کا فیصلہ ہی کچھ اور تھا، میں کسی چھوٹے یا بڑے سفر سے لوٹتا تو ہر ہر بات، ملاقات، علمی، فکری استفادے نیز مدرسہ کے تعارف کے متعلق بھرپور استفسار کرتے، مشورے دیتے اور خوش ہوتے۔

> **وہ غیروں کے کام کو اپنا کام سمجھتے تھے، دوسروں کے بچوں کے لیے وہ کرتے تھے جو خود ان کے والدین بھی کرنے پر آمادہ نہ ہوں، سردی کی راتیں ہوں یا سخت گرمی کی دوپہر وہ دوسروں کے ادنیٰ سے کام کے لئے ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے تھے، لوگ حیرت سے سوچتے کہ ڈاکٹر صاحب سوتے کب ہیں، صبح سے اٹھ کر رات کے ۱۰-۱۱ بجے تک بس وہ بندگان خدا کے لئے ان ہی کے درمیان رہتے تھے، لیکن ؎**
> **وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ**

اخراجات کے متعلق طرح کی تعریف و پڑتی تو ایک دور اندیش پناہ مسرت کا اظہار قاہرہ میں شوال میں مؤتمر منعقد ہو رہی تھی اور

وہ غیروں کے کام کو اپنا کام سمجھتے تھے، دوسروں کے بچوں کے لیے وہ کرتے تھے جو خود ان کے والدین بھی کرنے پر آمادہ نہ ہوں، سردی کی راتیں ہوں یا سخت گرمی کی دوپہر وہ دوسروں کے ادنیٰ سے کام کے لئے ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے تھے، لوگ حیرت سے سوچتے کہ ڈاکٹر صاحب سوتے کب ہیں، صبح سے اٹھ کر رات کے ۱۰-۱۱ بجے تک بس وہ بندگان خدا کے لئے ان ہی کے درمیان رہتے تھے، لیکن ؎

وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ

ڈاکٹر صاحب مرحوم میں ملت کا درد، ملی شعور بدرجہ اتم موجود تھا، تحمل و برداشت کی صلاحیت آخری درجہ میں قدرت نے عطا کی تھی، اخلاقی بلندی میں وہ اپنی مثال آپ تھے، ان کی زندگی کے اگر تین حصے کیے جائیں تو دو حصے انہوں نے ملت وسماج کی خدمت میں صرف کیے، ان کا خاندان بارہ بنکی سے علی گڑھ منتقل ہوگیا، ندوہ کے بعد علی گڑھ میں ان کی تعلیم ہوئی، یہیں کے ایک گاؤں سے اپنی کلینک کا آغاز کیا، سماج کی اصلاح اور ملت کی فکر ابتدا ہی سے دامن گیر رہی، کبھی تعلیمی گشت کیا، اور لوگوں کو بچوں کی تعلیم پر آمادہ کرنے کے ساتھ وسائل کا نظم کیا، کبھی عید ملن کی تقریبات کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو فتح کیا، پھر جب وہ قریب آگئے تو ان کی اصلاح کی فکر کی، کبھی سیرت کمیٹی قائم کر کے کچھ کر گزرنے کی ٹھان لی، فسادات کے زمانے میں ریلیف کا کام اس طرح کیا کہ جان پر بن آئی اور تنکا تنکا جوڑ کر بنایا ہوا آشیانہ بھی برباد ہوگیا، جیل گئے اور مصائب سے دوچار ہوئے لیکن رکے نہیں، ٹھہرے نہیں کہ آپ تو اس پر یقین رکھتے تھے۔

سب کھو کے تیری راہ میں دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ کچھ مکاتب قائم کیے، پھر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن تشکیل دیا، اس کے بعد فاؤنڈیشن کے تحت متعدد مکاتب و مدارس اور اسکول کی بنیاد ڈالی، ڈاکٹر صاحب کے پاس وسائل کی بہتات کبھی نہیں رہی لیکن جذبۂ عمل اور قوت برداشت کے ساتھ اخلاص کی طاقت سے پرواز کرتے رہے، حتی کہ علی گڑھ میں ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس نے اپنی وسعت میں ندوۃ العلماء کے فکر و منہج کی نمائندگی کی اور جامعیت میں فکر ابوالحسن کا علمبردار بنا بلکہ اس کی بے لوث ترویج واشاعت میں اپنا مقام پیدا کیا۔

علی گڑھ میں اس مدرسہ کا قیام ندوے کی صدائے بازگشت بھی ہے اور ڈاکٹر صاحب کا تاریخی و تاریخ ساز کارنامہ بھی، ڈاکٹر صاحب مولانا علی میاںؒ کے شیدائی اور ان کی فکر کے داعی تھے، ان کی ہر بات سے ان کو بڑی عقیدت تھی، عقیدت ہی نہیں بے مثال عقیدت تھی، بعد میں ان کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم سے بھی انہوں نے ہمیشہ اسی عقیدت کا اظہار کیا، مرض کے دوران جب دو آدمیوں کے سہارے سے چلنے پر مجبور ہو چکے تھے پھر بھی دو مرتبہ سفر کر کے حاضر خدمت ہوئے، تادم آخر انہیں اور ان کے افراد خاندان کو یاد کرتے رہے اور ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے رہے، ندوہ اور اس کی فکر سے بھی ان کو بے پناہ محبت تھی، وہاں سے کوئی آجاتا تو اپنے آپ کو نچھاور کر دیتے، کبھی اگر مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کی آمد ہوتی تو ان کی شیفتگی و وارفتگی دیکھتے بنتی، مولانا سید عبداللہ حسنیؒ صاحب یا مولانا بلال حسنی صاحب آتے تو ان کی مہمان نوازی سخاوت کی داستان بن جاتی، پچھلے ۶-۷ سالوں میں ندوہ سے علی گڑھ سب سے زیادہ آمد مولانا سید سلمان الحسینی صاحب کی ہوئی ہے، ان کی آمد پر ڈاکٹر صاحب مرحوم سب سے زیادہ اس کا اہتمام فرماتے کہ کسی طرح یونیورسٹی کے مختلف شعبوں اور ہاسٹلوں میں ان کے متعدد پروگرام ہو جائیں، ہر چھوٹے بڑے پروگرام کے لئے تن من دھن سے لگ جاتے اور جتنی دیر ان کا قیام علی گڑھ میں رہتا سائے کی طرح ان کے ساتھ چپٹے رہتے، یہ معاملہ ان کا تقریباً ہر اس شخص کے ساتھ ہوتا جس کا تعلق حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے نسبی یا قلبی وفکری ہوتا، مولانا محترم کو تو ڈاکٹر صاحب ''ملت کی ضرورت'' کہا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی خصوصیت تھی کہ وہ یہ سمجھ لیتے تھے کہ کس سے کیا کام لینا ہے اور کون کس مزاج کا ہے، چنانچہ ہر ایک سے اسی اعتبار سے پیش آتے، متضاد فکر و مزاج کے لوگوں سے یکساں تعلق و محبت رکھنا ڈاکٹر صاحب کا ہی حصہ تھا، وہ ہر ایک کا مزاج پہچان کر اس کے ساتھ معاملہ کیا کرتے، خود میں اپنے بارے میں پوری سچائی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے مزاج وجذبات

کی ناز برداری کی ہے، یہ ان کی عظمت اور بے مثال اخلاقی بلندی کی بات ہے کہ انہوں نے مجھ ناچیز کی بھی اس حد تک رعایت کی کہ آج میں ''ناز برداری'' کی تعبیر اختیار کرنے پر مجبور ہوں، انہوں نے مجھے اہتمام تو سونپ دیا لیکن فکریں ساری خود اوڑھے رہے، ان کی وسیع الظرفی اور رعایت ومروت واقعی بے مثال تھی، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ میں رات میں سوچتا کہ صبح ڈاکٹر صاحب تشریف لائیں گے تو یہ بات کرنی ہے، صبح دفتر پہنچتے ہی میں پڑھانے یا لکھنے میں مشغول ہوجاتا کہ اسی حال میں ۱۰ بج جاتے، پھر میں فون کرتا ڈاکٹر صاحب کیا آج آپ تشریف نہیں لائے، فرماتے: ''طارق بھائی تین مرتبہ آپ کے کمرے میں جھانکا آپ مشغول تھے تو میں نے آنا مناسب نہ سمجھا'' اللہ اکبر- کیسا عظیم اور قیمتی سرپرست رخصت ہوگیا، کبھی بھی اگر میں لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوا تو ڈاکٹر صاحب قطعی مداخلت نہ فرماتے، ایک مرتبہ تو انتہا کردی اس پیکر اخلاق نے، ابھی کوئی ۷-۸ ماہ پہلے کی بات ہے میں لکھنے میں مشغول تھا، وہ داخل ہوئے اور میری میز کے سامنے کرسی پر جلوہ افروز ہوگئے، ____ کس احتیاط سے آئے گے ہوں گے کہ مجھے ہوا بھی نہ لگی ____ جب بات مکمل ہوئی یا مضمون مکمل ہوا میں نے قلم رکھ کر کرسی پیچھے کرکے آرام کرنے کو ٹیک لگائی تو سامنے ڈاکٹر صاحب کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک گیا، عجلت کے ساتھ میری زبان سے سلام کے بول نکلے اور عرض کیا ڈاکٹر صاحب آپ!!! فرمایا: ''طارق میاں آدھے گھنٹہ سے انتظار میں بیٹھا ہوں کہ آپ ہاتھ روکیں تو بات کروں، انہیں اک دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی لیکن بات ضروری تھی اس لیے واپس نہیں گیا انتظار کرتا رہا'' آہ- میری علمی سرپرستی کرنے والا یہ محسن آج مجھ سے بچھڑ گیا اور ہمیشہ کے لئے راہ فراق اختیار کرلی، آج چھوٹا سا بچہ اور ادنیٰ سا طالب علم بھی دو منٹ انتظار کرنے کو تیار نہیں اور یہ بانی ادارہ اتنی رعایت برتنے کو تیار، ایسے ہی مربی تو زمانہ قدیم میں افراد سازی کا کام کیا کرتے تھے، صنعت رجال کوئی ان جیسے لوگوں سے سیکھے، ان کا یہی سلوک تھا جس نے مجھے سب بھلا دیا، میں علی گڑھ اعلیٰ تعلیم کے لیے آیا تھا لیکن بہت دن دنیا کسی کی فکر بھی مجھے پریشان نہ کرسکی، ڈاکٹر صاحب نے ایسا بنادیا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بس مدرسہ کا ہوکر رہ گیا، میں آج کس قدر آپ کی کمی محسوس کررہا ہوں، کس طرح آپ کی معصوم صورت کا پرکشش جمال دیکھنے کو میری آنکھیں ترس رہی ہیں، میں کیا کہوں سوائے اس کہ کہ آپ دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ایسے نقوش چھوڑ گئے جو نہاں خانہ دل میں مرتسم ہیں، آپ ایک لمحہ کے لئے بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی خصوصیت تھی کہ وہ یہ سمجھ لیتے تھے کہ کس سے کیا کام لینا ہے اور کون کس مزاج کا ہے، چنانچہ ہر ایک سے اسی اعتبار سے پیش آتے، متضاد فکر و مزاج کے لوگوں سے یکساں تعلق و محبت رکھنا ڈاکٹر صاحب کا ہی حصہ تھا، وہ ہر ایک کا مزاج پہچان کر اس کے ساتھ معاملہ کیا کرتے، خود میں اپنے بارے میں پوری سچائی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے مزاج و جذبات کی ناز برداری کی ہے

جمالك في عيني وحبك في قلبي
وذكرك في فمي فأين تغيب

میں کلکتہ انٹرویو کے لئے گیا واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ''طارق بھائی انٹرویو کیسا ہوا'' میں نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ پہلا انٹرویو تھا جو بہت خراب ہوا، (وجہ یہ ہوئی کہ دوران انٹرویو وائس چانسلر نے روک دیا اور یہ کہا کہ آپ کے پاس ہائی اسکول اور انٹر کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے، یہ مدرسہ بیک گراؤنڈ والوں کی پریشانی ہے) ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ''اچھا ہوتا بھی کیسے میں دعا جو کررہا تھا کہ خراب ہو'' پھر کہنے لگے کہ ''میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کا یہاں کروادے جیسے یہ دعا کرتا ہوں کہ باہر آپ کا کہیں نہ ہو'' اور معاملہ ایسا ہی ہے، یہاں یونیورسٹی میں میرا ایک انٹرویو تھا تو ایک صاحب کو میرے سامنے فون کیا اور کہا ''صاحب

آپ ان کی سفارش فلاں سے کر دیجئے اور اگر ان کے پاؤں پڑنے سے کام چلے تو میں طارق میاں کے لئے یہ کرنے کو تیار ہوں'' یہ باتیں تنہائی کی نہیں اس کے کئی کئی گواہ موجود ہیں، ایسے عظیم انسان، اپنے محلّہ اور اپنے خاندان کی پہچان بن جانے والے شخص کی زبان سے نکلے یہ جملے ہی ایک حساس واحسان شناش کے لئے بہت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جب سے مدرسہ قائم کیا تب سے ان کی عاجزی وانکساری اور تواضع میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، یوں تو یہ اوصاف بچپن سے ان کے مزاج کا حصہ تھے، وہ صبح اٹھ کر شام تک مدرسہ کی فکر میں کڑھتے، گھلتے اور تگ ودو کرتے، ہر وقت تعلیم اور مراکز تعلیم کا زوال ان کے اعصاب پر سوار رہتا، کوئی نووارد انہیں جب دیکھتا تو اس کے لیے یہ سمجھ پانا مشکل ہوتا کہ یہی مدرسہ کے بانی وناظم ہیں، ایک ملازم کو بھی کرسی کھینچ کر بیٹھنے کو دیتے، ہر کسی سے بڑی محبت سے ملتے، ہر کام خود کرتے، ایک مرتبہ کسی نے انہیں کمبل طلبہ کے لیے عطیہ کیے، گاڑی میں رکھ کر لائے، تعلیمی اوقات تھے، ملازم، اساتذہ، طلبہ سب موجود تھے، خود ہی اتار اتار کر رکھنے لگے، دیکھنے والے دانتوں تلے انگلیاں دبا کر بیٹھ گئے۔

انہوں نے بڑے خلوص اور عزم وحوصلہ کے ساتھ مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، جو کہ تکمیل تھی حضرت مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی دیرینہ خواہش کی، ڈاکٹر صاحب اساتذہ سے مخاطب ہو کر کہتے ''ہندوستان میں بے شمار مدارس ہیں، ایک روایتی طرز کے مدرسہ کی قطعی مزید ضرورت نہیں ہے، اگر آپ اس کو روایتی مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس پر ابھی تالا لگا دیجئے، ہم اسے ایک مثالی ادارہ بنانا چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ یہاں طلبہ کی ایسی تربیت ہو اور علمی وعملی طور پر ایسے مضبوط ومکمل ہوں کہ مغرب پرستوں سے لوہا لے سکیں، اسلام پر ان کے اعتماد کو بحال کر سکیں، یاد رکھیے کہ ہم یونیورسٹی کی ناک کے نیچے ہیں ہمیں اپنا ایک مثالی کردار پیش کرنا ہوگا، اپنی افادیت ثابت کرنی ہوگی ورنہ پھر ہمیں قبول نہیں کیا جائے گا''

مدرسہ کی علمی، عملی اور فکری وثقافتی ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں اور ہمہ تن مصروف رہتے، راقم نے جب کبھی ادنیٰ سے کام کی طرف توجہ دلائی تو بس فوراً اسے کر ڈالنے کی تلقین کی، ہمت وحوصلہ تو کوئی ان سے سیکھے، وسائل کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں، اس کے لیے امکان بھر کوشش ضرور کرتے رہے مگر اس کی وجہ سے کسی کام کو مؤخر نہیں کیا، راقم نے عرض کیا کہ رابطۂ ادب اسلامی کے قیام کو ۲۸ سال ہو رہے ہیں، علی گڑھ جیسے شہر میں اب تک اس کا کوئی سیمینار نہیں ہوا، بس میرا یہ خیال ان کے دل ودماغ میں ایسا سرایت کر گیا کہ لمحوں میں انہوں نے اس کے انعقاد کا فیصلہ کر لیا اور مجھے حکم دے دیا کہ آپ حضرت مولانا دامت برکاتہم سے رابطہ کریں اور اجازت لیں، یہ سیمینار اب یہاں ہونا ہے، چنانچہ ۹-۱۰ جنوری ۱۳ء کو رابطہ کا سیمینار پوری آن بان کے ساتھ منعقد ہوا، اس کے انعقاد کے فیصلہ کے بعد مرحوم ڈاکٹر صاحب نے انتظام کی سب فکریں اپنے اوپر اوڑھ لیں اور مجھے علمی کاموں نیز اسے کامیاب بنانے کی فکروں کے لئے فارغ کر دیا۔

میں نے اس سیمینار کی رپورٹ لکھتے ہوئے اس خیال کا اظہار کر دیا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر اب تک کوئی عالمی سیمینار ہندوستان میں نہیں ہوا، جبکہ عالم عربی اس وقت مطالبہ کر رہا ہے کہ اس کی فکری آبیاری کی جائے، اس موقع پر اگر فکر ابوالحسن پر کانفرنس کے ذریعہ ایک بار پھر عالم عربی کو پیغام دیا جائے تو کیا اچھا ہو، اور کیا خوب ہو کہ یہ کام اس فاؤنڈیشن کے ذریعہ انجام پائے جو ان کے ہی نام سے منسوب ہے، میرا یہ خیال ڈاکٹر صاحب کے لیے سنہرا خواب بن گیا، وہ اس کی تعبیر کے لیے بس اسی وقت سے تڑپنے لگے، گویا اب اسے شرمندۂ تعبیر کیے بغیر ان کو چین نہیں تھا، بڑی رکاوٹیں آئیں، مسائل کا انبار تھا، لیکن اس نام سے ان کو جو عقیدت تھی وہ بے مثال تھی، اللہ اللہ کر کے یہ کام بھی انجام پایا، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر ایسا علمی مجموعہ وجود میں آیا کہ اب اس کے حوالے کے

بغیر حضرت مولانا پر کوئی کام مکمل نہیں، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب پھر سے جوان ہو گئے تھے، باوجود بڑی تکلیف سے گزرنے کے جس طرح وہ انتظامات کر رہے تھے، جس تواضع کا مظاہرہ کر رہے تھے، جس طرح وفود عرب وعجم کے سامنے بچھے جا رہے تھے وہ لائق دید و قابل رشک تھا، نہ کھانے کی فکر تھی نہ پیاس کا احساس، بعض لوگ بتاتے ہیں کہ اندرون مدرسہ تو وہ جوتے کے بغیر موزے پہنے دوڑ رہے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کسی سے کہتے نہ تھے بلکہ خود کر لینے کے عادی تھے، وہ اپنی دس سالہ محنت کو اس طرح برگ وبار لاتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے، جب ان میں یہ احساس انگڑائی لیتا کہ اس چھوٹے سے مدرسہ نے عالمی سطح کا کام کر لیا جس کی عمر بھی قلیل، جس کے وسائل بھی معدوم، جس میں نہ اٹھنے کی جگہ نہ بیٹھنے کی پھر بھی یہ کام انجام پا گیا تو مسرت کی لکیر چہرۂ پر نور پر کھنچ جاتی، جذبۂ شکر کے آنسو چھلک جاتے، امیدوں کی چمک پیشانی پر دوڑ جاتی، حقیقت یہ ہے کہ کبھی وسائل پر توجہ ہی نہ دیتے تھے، عزم وحوصلہ میں کوہ ہمالہ ثابت ہوتے تھے، اس قلیل مدت میں یہ ادارہ جس شکل میں سامنے آیا اور دیگر ادارے مثلاً ہاتھرس کا دارالعلوم اور آئی ٹی آئی کے قیام کا فیصلہ یہ سب ان کے کام سے عشق اور ملت کی خدمت کے جذبہ کا نتیجہ ہے، جو کام وہ کر گئے اگر وسائل پر یقین کرتے، اور کلکولیشن کی عادت ہوتی تو برسہا برس لگ جاتے، کہنے والے نے سچ کہا ہے ؎

عزم راسخ سے ہے نشانِ قیس و شان کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

ڈاکٹر صاحب کے پہلے آپریشن سے قبل میں نے مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب کو محاضرات کی دعوت دی تھی، پھر ان محاضرات کی رپورٹ ندائے اعتدال میں ارادہ رکھتا ہے کہ امسال ندوۃ العلماء سے عربی اردو تقریر ومقالہ نگاری اور بیت بازی مقالہ نگاری کا یہی تیسرا عنوان (ندوۃ تحریک، اپنی تاریخ اور اپنے مرکز کے متعلق کرے کہ ادارہ اپنے اس پروگرام کو عملی صاحب جس دن رسالہ چھپ کر آیا اس کی درمیان میں انگلی ڈالے تشریف لائے، ہوگئی، لیکن فرمانے لگے ''طارق میاں اس میں نے کہا کوئی ۲ لاکھ روپے، باوجود اس ہمارے مدرسہ کی حالت بہت خستہ تھی، بھی لرزہ نہ تھا، بس فرمایا کہ اس کی تیاری گا، اسی دوران مرض کی تشخیص ہوئی اور تلے سے زمین نکل گئی، یہ ارادہ بھی ٹھنڈے بعد پہلی بار ہی جب مدرسہ تشریف لائے تو پہلی بات یہی کہی کہ ''اس پروگرام کا کیا ہوا'' میں نے کہا ڈاکٹر صاحب مالی انتظام کا مسئلہ ہے آپ صحت مند ہو جائیں پھر انشاء اللہ یہ کام انجام پائے گا، فرمایا نہیں! اسے کر ڈالو، خدا خدا کر کے پروگرام منعقد ہوا، اس وقت ان

.....اس موقع پر ڈاکٹر صاحب پھر سے جوان ہو گئے تھے، باوجود بڑی تکلیف سے گزرنے کے جس طرح وہ انتظامات کر رہے تھے، جس تواضع کا مظاہرہ کر رہے تھے، جس طرح وفود عرب و عجم کے سامنے بچھے جا رہے تھے وہ لائق دید و قابل رشک تھا، نہ کھانے کی فکر تھی نہ پیاس کا احساس، بعض لوگ بتاتے ہیں کہ اندرون مدرسہ تو وہ جوتے کے بغیر موزے پہنے دوڑ رہے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کسی سے کہتے نہ تھے بلکہ خود کر لینے کے عادی تھے

لکھتے ہوئے لکھا تھا ''ادارہ اس طرح کا ملحق کم از کم یوپی کے تمام اداروں سے کے مقابلوں میں طلبہ کو شریک کرے اور العلماء کا علمی ودعوتی منہج) رکھے، کہ اپنی معلومات عامہ اور تازہ ہو سکیں، خدا جامہ پہنانے میں کامیاب ہوا''، ڈاکٹر آئندہ صبح کو رسالہ ہاتھ میں لیے میں نے سوچا کہ شاید کوئی بھونڈی غلطی پروگرام کو کر ڈالو، اس کا کیا تخمینہ ہے'' کے کہ سال گزشتہ مالی اعتبار سے لیکن عزم وہمت کے اس پہاڑ پر ذرا شروع کرو، اللہ کہیں سے انتظام کرے آپریشن کی اطلاع ملی تو میرے پیروں بستہ میں ڈال دیا، آپریشن کے کچھ دن

کی نقاہت کا حال یہ تھا کہ ایک اور بسا اوقات دو لوگوں کے سہارے سے چلتے تھے، مگر مستقل ۳؍دن پورے نشاط کے ساتھ سارے پروگراموں میں شریک رہے، صبح، دوپہر اور شام ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنی، آنے والے مہمانوں سے بشاشت وجہ کے ساتھ ملتے، مدرسہ کی ترقی کے لیے دعاؤں کی درخواست کرتے، پورے صوبہ سے آئے طلبہ سے ملاقاتیں کرتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، مشورے دیتے اور انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، افتتاحی نشست میں نحیف آواز مگر ہمت وحوصلہ سے بھرپور خطاب کیا اور طلبہ کو مستقبل کی ہمہ جہت تیاری کی تلقین کی، انعامات دینے میں ان کی قدرتی فیاضی شباب پر ہوتی تھی، اس مرتبہ بھی ایک ایک انعام کو دیکھا اور یوں خوشی کا اظہار کیا جیسے کوئی قیمتی دولت ہاتھ آ گئی ہو، انعام حاصل کرنے والے ہر طالب علم سے ملتے، اسے مبارکباد دیتے، اس کی دلجوئی کرتے، اور ایسے خوش ہوتے جیسے واقعی یہ بہت بڑا کارنامہ اس نے انجام دیا، اس پروگرام میں اپنی تمام کمزوری وخرابی صحت کے باجود وہ برابر شریک رہے، ان کا حوصلہ قابل دید تھا، ان کا عمل واخلاص قابل تقلید ہے، ایک ایک شخص کی رعایت ان کے مزاج کا خاصہ تھا، دوسرے دن بعد عشاء شعری نشست تھی، خود ان کا ادبی ذوق بہت ستھرا تھا، ان کے ایک مہمان دوست صدارت کر رہے تھے، باوجود نقاہت اور ہم لوگوں کی ضد کے ان کی رعایت میں ۲ بجے رات تک بیٹھے رہے، دراصل ان کو صرف اپنا خیال نہیں، دوسروں کا خیال تھا یا مدرسہ کی فکر، کاش ہر ذمہ دار اس طرح سوچے جس طرح ہمارے ڈاکٹر صاحب سوچتے تھے، دوسری مرتبہ جب دماغ کا آپریشن طے ہوا، ہم سے کہا طارق بھائی! غزالی بھائی کو لیتے جائیں یہ وظیفہ کرتے رہیں گے، ہم نے کہا بالکل، اس میں کہنے کی کیا بات- دوپہر سے ساڑھے چھ بجے تک آپریشن ہوا- وہ بھی دماغ کا اور پھر دوسری مرتبہ، مگر جوں ہی ہوش میں آئے اور چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر کے بلانے پر ICU میں ملنے گئے تو پہلی بات جو زبان سے نکلی وہ ہر ذمہ دار واستاد کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے، فرمانے لگے ''بیٹے یاسر! غزالی بھائی کو رات میں ہی روانہ کرنے کا انتظام کرو، ورنہ آج کی طرح کل بھی طلبہ کا نقصان ہوگا''۔ وہ ہر دم اور ہر لمحہ مدرسہ کے لئے فکر مند رہا کرتے تھے، آخری سانس تک مدرسہ ان کے اعصاب پر سوار تھا، پہلی مرتبہ آپریشن کے لیے جانے سے قبل جس طرح وہ نصیحتیں فرما رہے تھے اور عزم وسکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے حوصلہ افزائی کر رہے تھے وہ ان ہی کا حصہ تھا، ان کا یہ یقین تھا اور وہ اسی پر تادمِ اخر عمل پیرا رہے۔

ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

مدارس کا زوال، مسلم یونیورسٹی میں مفقود ہوتی قدریں انہیں ہمہ وقت بے چین رکھتیں، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے ان کا ہمیشہ گہرا تعلق رہا، ان میں قائدانہ صلاحیت ہی ایسی تھی کہ ہر جگہ ان کی قدر کی جاتی، یونیورسٹی کے ہاسٹلوں سے طلبہ اگر مطب آتے تو ان کو فکری غذا کے ساتھ فری دوا دیتے، یہی عمل طلبۂ مدارس کے ساتھ کرتے، ڈاکٹر صاحب کے پاس دولت کبھی نہیں رہی بلکہ میری معلومات کی حد تک زکوۃ بھی ان پر کبھی فرض نہ ہوئی، لیکن ان کے تعلق مع اللہ کا نتیجہ تھا کہ ان کا ہاتھ بہت دراز تھا، سخاوت تو چہرے سے ٹپکتی تھی، مجھے جان کر حیرت ہوئی کہ وہ صرف پریشان حالوں، طلبہ اور غریبوں کو ہی فری دوائیں نہیں دیتے بلکہ اہل تعلق کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے خواہ وہ صاحب ثروت کیوں نہ ہوں، یہی نہیں بلکہ بسا اوقات دیکھا کہ اسٹور سے دوائیں منگا کر دیں، اللہ نے برکت بھی خوب دی تھی ان کے ہاتھ میں، ہر شخص کی ادنیٰ ضرورت کا خیال کرتے اور اس کی فکر کرتے، ایک بڑے عالم یونیورسٹی میں پروگرام کے لئے آئے، قیام مدرسہ میں فرمایا، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ یہ لوگ بہر حال اپنی شایان شان ظاہری چیزوں پر توجہ کم دیتے ہیں اسی لیے بہت معمولی چپل پہن رکھی ہیں، کسی کو ہوا بھی نہ لگی خاموشی کے ساتھ اپنے خادم سے نئی

قیمتی چپلیں منگوائیں اور پرانی ہٹا کر اس کی جگہ رکھ دیں، شیروانی اس قدر ہدیہ کرتے بالخصوص علماء اور اہل علم کو کہ میں نے ایک مرتبہ مزاحاً کہا کہ ڈاکٹر صاحب ''ٹوپی پہنانے'' کا محاورہ تو سنا تھا آپ نے اپنے جود وعمل سے اردو میں ''شیروانی پہنانے'' کے محاورے کا اضافہ کر دیا، ایک بڑے سادہ مزاج صاحب علم کی آمد ہوئی، مرحوم نے دیکھا کہ ان کی شیروانی پرانی ہوگئی ہے اور ان کو آئندہ کسی بڑے عالمی پروگرام میں شرکت کرنا ہے، ان سے درخواست کی مگر جب انہوں نے ہر طرح معذرت کی، تو بہانے سے لے جا کر ان کا ناپ دلایا اور پھر شیروانی ان کو پہنچائی۔

ہماری عادت ہے کہ اکثر اپنے ساتھیوں اور معاصرین کو محاضرات کے لیے بلاتے، مقصد یہ ہوتا کہ کام بھی ہو جائے اور وقت بھی کم لگے اور مدرسہ پر بوجھ بھی کم ہو، ڈاکٹر صاحب ان کے ساتھ بھی بڑے اعزاز واکرام کا معاملہ فرماتے، ان کے محاضرات میں بہ حیثیت سامع شریک ہوتے اور اس طرح پیش آتے جس طرح اس دور میں کوئی چھوٹا بھی بڑے سے نہیں پیش آتا۔

اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں خوب نوازا تھا، ان سے خوب کام لیا، وہ گئے تو اس حال میں گئے کہ اپنے پیچھے وہ تینوں چیزیں چھوڑ گئے جن کا ثواب مطابق ان کو تا قیامت ملتا صدقہائے جاریہ کا بھی لیے دعاء مغفرت کرنے وسائل علم کا وہ انتظام کر گئے قیامت اپنی قبر میں دیکھتے

.....وہ گئے تو اس حال میں گئے کہ اپنے پیچھے وہ تینوں چیزیں چھوڑ گئے جن کا ثواب حدیث شریف کے مطابق ان کو تا قیامت ملتا رہے گا، وہ اپنے لیے صدقہائے جاریہ کا بھی انتظام کر گئے، ان کے لیے دعاء مغفرت کرنے والی ذریت بھی ہے اور وسائل علم کا وہ انتظام کر گئے کہ جس کی بہاریں وہ تا قیامت اپنی قبر میں دیکھتے رہیں گے

حدیث شریف کے رہے گا، وہ اپنے لیے انتظام کر گئے، ان کے والی ذریت بھی ہے اور کہ جس کی بہاریں وہ تا رہیں گے، بس ان کے قائم کردہ ادارے کی بابت یہی دعاء ہے کہ وہ ان کے فکر ومنہج کو سینے سے لگائے رکھے اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

یا الٰہی تا ابد قائم یہ میخانہ رہے

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جو کچھ کیا وہ اتنی تھوڑی مدت میں بہت ہے، لیکن متعدد کاموں کی تمنا وہ اپنے دل میں لے کر چلے گئے، وہ ہر وقت سوچتے تھے اور ہر پہلو سے غور کرتے تھے، دینی تعلیم کی ضرورت محسوس کی تو ایک مثالی مدرسہ کی بنیاد ڈالی، جس کے متعلق ان کی خواہش تھی کہ وہ مدرسۃ العلوم سے ایک چھوٹی سی ''علی میاں اسلامی یونیورسٹی'' میں تبدیل ہو جائے، اس خواہش کا اظہار وہ آخر تک کرتے رہے، جس محلّہ میں یہ مدرسہ قائم ہے وہ انتہائی پسماندہ علاقہ ہے، اس محلّہ کی اکثریت مزدور پیشہ اور جہالت کی ستائی ہوئی ہے، سب ادھر ادھر سے ۹۲ء کے فسادات میں بھاگ کر آئے ہوئے لوگ ہیں، ان کے بچوں کی ابتر حالت نے ان کو تڑپایا تو ایک پرائمری اسکول کی بنیاد ڈالی جو تقریباً مفت تعلیم کا انتظام کر رہا ہے، اور گلیوں سے بچوں کو گھسیٹ کر اسکول جانے کی عادت ڈال رہا ہے، لوگوں کو دیکھتے رہے کہ ہاتھرس میں ارتداد کے نام پر قومی اثاثہ پروفیشنل اسکولز قائم کرنے میں استعمال ہو رہا ہے، بالآخر ایک صاحب خیر کی مدد سے ایک مدرسہ واسکول وہاں بھی قائم کیا، لیکن ڈاکٹر صاحب کے یہ سب پروجیکٹ ابھی بعض اعتبار سے بالخصوص تعمیری لحاظ سے ادھورے ہیں، اسی محلّہ میں ایک بڑی تعداد ان بچوں کی تھی جو تھوڑے بہت علم کے بعد غربت کے سبب سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیتے تھے اور غلط کاموں میں ملوث ہو جاتے تھے تو ITI کے قیام کا فیصلہ کیا جو اب شروع ہونے کے قریب ہے۔

وہ دعوتی لٹریچر کو عام فہم مگر علمی اسلوب میں پیش کرنے کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ ایسے اسکالر تیار ہوں جو روزانہ کے اخبارات میں اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈوں کا دفاع کریں، اس کے لیے شعبۂ بحث وتحقیق قائم کیا مگر وسائل کی

قلت نے طلبہ کو خاطر خواہ وظیفہ بھی نہ دینے دیا جس کے سبب یہ شعبہ تقریباً تعطل کا شکار رہا، ڈاکٹر صاحب ائمہ مساجد کی تنظیم اور تدریب بھی چاہتے تھے اور ان کے ذریعہ اصلاح و تعلیم کو بہت آسان سمجھتے تھے، وقتاً فوقتاً شہر کے مختلف محلوں میں اصلاحی پروگرام منعقد کرتے رہنے کی تلقین کرتے تھے، غیر مسلموں میں دعوتی کام کے لئے اکثر کوشاں رہتے، یونیورسٹی کے طلبہ کو وہ فکری غذا پہنچانے کے لئے بہت کوشاں رہتے، ان کی نظر بہت دوررس تھی، جب میں پہلی مرتبہ ترکی گیا تو کہنے لگے کوشش کیجئے کہ کوئی ترک استاد مدرسہ میں آجائے اور کچھ طلبہ کی زبان سکھائے کیوں کہ اس وقت ترکی دعوتی کام کا بہت اہم اور وسیع میدان ہے۔

مختصر یہ کہ وہ زندگی بھر اسم بامسمی ہوکر رہے، اپنے نام کی معنویت ثابت کرتے رہے، جانے کتنوں کے لئے رحمت بن کر برسے اور کتنوں کو اپنی سخاوت سے مستفید کیا، کتنے لوگوں کی فریادیں سنیں اور کتنوں کی دادرسی کی، تھے وہ غیاث تو پھر ان کے ابر کرم بن کر برسنے میں کیا شک، پھر نسباً صدیقی تھے، نرم دلی و نرم گفتاری، رقیق القلبی صدیقیت کا حصہ ہے، دوسروں کے لیے اپنے کو مٹانا اور دین پر اپنے کو قربان کرنا، جذبۂ قربانی سے سرشار ہونا تو صدیقیت کی شان ہے، ان کی شخصیت و خدمات ایسی نہیں کہ انہیں چند صفحات میں سمیٹ دیا جائے، اس وقت جو ذہنی کیفیت ہے اس میں قلم برداشتہ یہ سطریں ہی بہت ہیں، آئندہ وقتاً فوقتاً اور باتیں قارئین کی نذر کی جائیں گی، ڈاکٹر صاحب کی زندگی جہد مسلسل اور یقین محکم سے عبارت تھی، انہوں نے اپنے عمل سے محبت کو فاتح عالم ثابت کیا، ان کی نظر بڑی بلند اور عالی ہمت تھی، مرض میں مبتلا ہونے سے پہلے تک ہر دم رواں دواں بلکہ جواں سال جیسے رہے، فکر ارجمند کے ساتھ دل درمند بھی رکھتے تھے، ان کی ان دونوں خصوصیات کو ان کی زبان ہوشمند جلا بخشا کرتی تھی، یاس و قنوت بڑے سے بڑے وقت میں بھی ان کے قریب نہ پھٹکتی، ہر وقت وہ توکل علی اللہ کے نشہ میں سرشار اسباب کی تلاش میں سرگرداں رہتے، آخر وقت تک انہیں اپنے ملی اور دینی کام کی فکر دامن گیر رہی کیوں کہ ان کا یقین بھی یہی تھا اور ان کا پیغام بھی یہی ہے، انہوں نے اپنے پیچھے اپنی روحانی اولادیں بھی چھوڑیں اور علم و تعلیم کی نشر و اشاعت کا مضبوط وسیلہ بھی، ان کے ادارہ سے منسلک لوگوں کو اقبال کے ان اشعار کو ڈاکٹر صاحب کا پیغام سمجھنا چاہیے اور اپنا لائحہ بنانا چاہیے، جن کا عکس ان کی زندگی میں نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی پر یہ اشعار سو فیصد منطبق ہوتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

وحسن أولئك رفيقاً

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ماضی کی یادیں

ماضی کی یادوں سے

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نوٹ: اکتوبر میں ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپریشن ہوا تھا، جس دن یہ اطلاع ملی کہ آپریشن ہونا ہے، تو چونکہ اس آپریشن کی خطرناکی معلوم شدہ تھی اس سے حواس باختہ ہوگئے، ان سے اس دوران جو قلبی تعلق ہوگیا تھا اس کے سبب طبیعت پر گہرا اثر پڑا، بالخصوص آپریشن کے لئے جانے سے قبل جس طرح وہ وصیتیں کررہے تھے اور ہم لوگوں کی ڈھارس بندھا رہے تھے اور جس جذبہ وحوصلہ کا مظاہرہ کررہے تھے اس سے کلیجے منہ کو آرہے تھے، فرطِ جذبات میں قلم برداشتہ اس وقت یہ سطریں لکھ ڈالیں، اس تحریر کو لوگوں نے اپنے اپنے نگاہ سے دیکھا، الگ الگ نام دیا، جس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہمارے برصغیر میں زندگی میں خراج تحسین پیش کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور مرنے کے بعد قصیدہ خوانیاں ہوتی ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جب اسے پڑھا تو ان کے آنسو چھلک پڑے، اس وقت ہم اسے پھر اس لیے نذر قارئین کررہے ہیں کہ بعد از وفات رخصت ہونے والے کی یہ خوبیاں زبان زدِ خاص وعام ہیں جن کے ذریعہ ہم نے زندگی میں ہی، انہیں خراج عقیدت پیش کیا تھا، ہمارے لئے یہ باعث افتخار ہے کہ ہم نے زندگی میں ہی انہیں خراج پیش کیا آج ہر شخص اپنی زبان اور اپنے قلم سے اس کے ہر ہر لفظ کی تصدیق وتائید کررہا ہے، اسی لیے اسے دوبارہ نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

بانی ادارہ کی علالت:

گزشتہ دنوں بڑی مصروفیت اور ذہنی الجھنیں رہیں، اسی درمیان ایک پریشانی یہ آگئی کہ اچانک علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے ناظم اور اس سے ملحق اداروں کے بانی ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی صاحب سخت علیل ہوگئے، ڈاکٹروں نے دماغ کے خطرناک آپریشن کا مشورہ دیا، اس سرجری کی خطرناکی نے متعلقین کے ہوش اڑادیے، لیکن سچ یہ ہے کہ دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے، اور نیکیوں کا ثمرہ انسان ایسے ہی موقع پر پاتا ہے، لوگوں نے بڑے پریشان کن واقعات سنائے، لیکن ڈاکٹر صاحب قبلہ کا الحمدللہ بڑا کامیاب آپریشن ہوا، ڈاکٹروں کے مطابق الحمدللہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد مکمل صحت یاب کرے، امید ہے کہ قارئین دل کی گہرائیوں سے ان کی صحتیابی کے لئے دعاؤں کا اہتمام کریں گے، ان کی ذات سے ملت کے کئی منافع متعلق ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت ودرازی عمر عطا فرمائے اور ان کے ذریعہ ملت کو نفع پہنچانے کا سلسلہ جاری وساری رکھے۔

یہ دنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن ان انسانوں میں بعض قیمتی ہیرے ہیں، ان ہی ہیروں میں ایک کوہ نور وہ ہے جس کو لوگ ڈاکٹر غیاث صدیقی کے نام سے پہچانتے ہیں، کم از کم میں نے جب سے ڈاکٹر صاحب قبلہ کو دیکھا دوسروں کے لیے ہی جیتے ہوئے دیکھا، اپنے لیے تو سب جیتے ہیں، اس دور مادیت میں ایسی بے نفسی بس ان ہی کا حصہ ہے، وہ بڑے باہمت، بلند اخلاق اور

بے نظیر اخلاص کے حامل بلکہ حسن اخلاق اور اخلاص ومحبت کا پیکر ہیں، سخاوت وفیاضی ان کی شخصیت کا جزء ہے، اخلاق واخلاص کے مجسمے اس دور میں نایاب بھی ہیں اور کمیاب بھی، بڑے تو بڑے چھوٹوں کی جس طرح وہ رعایت کرتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ان کی قدر کرتے ہیں وہ قابل تقلید ہے، ہر کسی کو راضی رکھنے کا سلیقہ کوئی ان سے سیکھے، ہر کس وناکس کی رعایت، سب کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ، دن رات کام کی لگن، ملت کے نونہالوں کے مستقبل کے تئیں تڑپ ان کو قدرت نے ودیعت کی ہے، ان کی طرح بزرگوں سے عقیدت، اہل علم کی قدر، ہر شخص کا احترام، اخلاص ومحبت، نرم خوئی ونرم دلی، رعایت ومروت، ان کے متعلقین ورفقاء کار میں کیا دور دور تک نظر نہیں آتی، ان کی رعایت ومروت ہی ہے کہ بعض بے حس یہ سمجھ کر کہ ان کو تو احساس ہی نہیں ہوتا پہ در پہ نقصان پہنچایا کرتے ہیں، اور موصوف محترم انسانیت کی رعایت میں ہر لحہ گھٹ گھٹ کر خون کے گھونٹ پیا کرتے ہیں، کمالِ بردباری یہ ہے کہ ایسے بے حس اور کم ظرف لوگوں کو ڈاکٹر صاحب یہ بھی احساس نہیں ہونے دیتے کہ گویا وہ ان کے کرتوتوں سے واقف ہیں چہ جائیکہ یہ باور کرائیں کہ ان کو ایسے لوگوں کی حرکتوں سے کس قدر تکلیف ہے، ان کی رعایت وشرافت کی انتہا ہے کہ وہ ایسے بہت سے لوگوں سے بے حد ادب واحترام اور خلوص ومحبت کے ساتھ ملتے ہیں جن کے بارے میں ان کو خوب ادراک ہوتا ہے کہ یہ لوگ محض رسمی طور پر اپنے مفادات کے لیے مل رہے ہیں۔

ان کے اس طرح کے عارضہ میں مبتلا ہونے سے طبیعتوں پر اثر ہونا لازمی اور فطری ہے، کہاں ہیں اس دور میں ایسے لوگ جو انسانوں کی قدر کریں، انسانیت کا احترام کریں، انسانی جذبات واحساسات کا لحاظ کریں، چھوٹوں کو بڑا سمجھیں، بڑوں کو تو سب بڑا سمجھتے ہیں، اصحاب ثروت ومناصب کا تو سب احترام کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ہمہ وقت ہر کس وناکس کی مدد کو تیار رہتے ہیں، ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے ہیں، وہ خود تو شوگر اور دل کے مریض ہیں لیکن دوسروں کو جس طرح ترجیح دیتے ہیں اور خدمت کرتے ہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ان کی سی عمر اور ان کی طرح کے امراض کے شکار لوگوں میں اس طرح کام کا جذبہ نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو وہ مخدوم ہی بننا پسند کرتے ہیں، ان کی طرح خادم قوم بن کر رہنا تو بس ان ہی کا حصہ ہے، کہاں ہیں ایسے لوگ جو اداروں کے بانی ہوں اور خود ہی صبح وشام تک زمینی سطح کے ایک انسان کی طرح مدرسہ کے سارے کام کرتے ہوں، اپنی گاڑھی کمائی کا اچھا خاصہ حصہ مدرسہ پر خرچ کرتے ہوں، ہر قدم پر اولادوں اور عزیزوں سے مدرسہ کا تعاون کراتے ہوں، انہوں نے بڑی حساس طبیعت پائی ہے لیکن دوسروں کی رعایت میں اپنی حساسیت کو خون کا گھونٹ سمجھ کر پینا کوئی ان سے سیکھے، یہ سطریں عجلت والجھن میں صحیح لیکن ایک عینی شاہد کے قلم سے ہیں، پہلی مرتبہ دیکھا کہ اللہ کے اس بندے کو اپنے شیخ ومرشد سے کس قدر عقیدت ہے، ایسی حالت میں چل کر حاضرِ خدمت اور ملتمسِ دعاء ہوئے جب کوئی ہلنا پسند نہیں کرتا، اپنے تمام بزرگوں سے دعاء کی درخواست کی، سرجری کے لئے جانے سے تھوڑی دیر پہلے تک بھی نہ اولادوں کا فکر دامن گیر رہا اور نہ گھر والوں سے مخاطب رہے، صرف مدرسہ کی دھن تھی، مختلف کاموں کا تذکرہ زبان پر تھا اور اپنے ادھورے کاموں نیز مدرسہ کے عدم استحکام کا فکر تھا جو انہیں پریشان کیے تھا۔

جہد مسلسل اور خلوص ومحبت کے اس پیکر اور حسن اخلاق کے اس مجسمے کو اللہ نے اس خوفناک مرحلہ سے صحیح وسالم گزارا، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے اور صحت وعافیت وعمر دراز عطا کرے، رشتہ داروں کے علاوہ احباب ومتعلقین اور قدردانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور زبان حال سے سب لا باس طهور إن شاء الله ہی کہہ رہے تھے، اس دعاء کا اثر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ہمیں ذات باری کی رحمت بے پایاں سے یقین کامل ہے کہ وہ ان سے ابھی اپنے دین اور ملت اسلامیہ کا مزید کام لے گا اور انہیں نونہالان ملت کے مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بنا کر عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے گا۔

☆☆☆

گوشۂ سیرت

نیا اسلامی سال، واقعۂ ہجرت اور ہم

محمد فرید حبیب ندوی

محرم الحرام سے نیا اسلامی سال شروع ہوتا ہے، اور ہر نیا سال ہمیں واقعۂ ہجرت کی یاد دلاتا ہے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ دور فاروقی تک اسلامی کلینڈر کا آغاز نہیں ہوا تھا، وہی پرانی تاریخیں جیسے عام الفیل وغیرہ چلی آرہی تھی، حضرت عمر فاروق کا جب دور آیا تو آپ نے سوچا کہ اسلامی کلینڈر کی بھی شروعات کرنی چاہیے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کس واقعہ کو بنیاد بنا کر پہلا اسلامی سال مقرر کیا جائے، یعنی جس سال سب سے اہم واقعہ پیش آیا ہو اسی کو اسلامی کلینڈر کا پہلا سال تجویز کیا جائے، اب ظاہر ہے کہ اس طرح کے اہم واقعات تو حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک دو نہیں، بے شمار ہیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ بہت اہمیت کا حامل ہے، جس سال آپ کی پیدائش ہوئی اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر، جس سال آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا اس سے زیادہ اہم سال اور کون سا ہوسکتا ہے؟ جس سال آپ نے طائف کا رخ کیا اس کی اہمیت کیا کسی سے کم ہے؟ جس سال غزوہ بدر میں مسلمانوں کو زبردست فتح نصیب ہوئی اس کی اہمیت کے کیا کہنے! اسی طرح صلح حدیبیہ، فتح مکہ، حجۃ الوداع اور آپ ﷺ کی وفات کے واقعات! غرض بہت سے واقعات تھے، صحابہ نے اپنی اپنی رائیں پیش کیں، لیکن عمر فاروقؓ کی دور بین نگاہیں پس پردہ بھی بہت کچھ دیکھ رہی تھیں، آپ کو شاید اندازہ تھا کہ اگر ولادت رسول، آغاز نبوت، غزوۂ بدر اور وفات رسول میں سے کسی واقعہ کی طرف اسلامی کلینڈر کو منسوب کر دیا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر مسلمان اسے ایک رسم بنالیں اور اسے اس طرح یادگار کے طور پر منانا شروع کر دیں جس کی اسلام اجازت نہ دیتا ہو۔

اس لئے آپ نے اُس واقعہ کو منتخب کیا جس میں بے پناہ دروس اور عبرت کے سامان ہیں، آپ نے واقعہ ہجرت کا انتخاب کیا، اور جس سال یہ واقعہ پیش آیا اسے پہلا اسلامی سال مقرر کر دیا۔ مہینوں کی ترتیب جو پہلے سے چلی آرہی تھی کہ محرم سے سال کا آغاز ہوتا تھا اور ذی الحجہ پر ختم ہوجاتا تھا اسے جوں کا توں رہنے دیا۔

تو گویا اسلامی کلینڈر کی نسبت واقعہ ہجرت سے جوڑی گئی، تاکہ جب بھی نیا اسلامی سال شروع ہو تو ہجرت کی یادیں تازہ کرلی جائیں اور اس میں چھپے اسباق کو ذہن نشین کیا جائے، اور واقعہ ہجرت کیا ہے؟ اللہ کے لئے، دین کے لئے اور اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینا، مال و دولت، زر و زیورات، زمین و جائداد، اہل و عیال اور آل اولاد سب کو راہ خدا میں نچھاور کر دینا، اپنی ہر خواہش پر رب کی مرضی کو ترجیح دینا، اپنی ہر چیز کو دین کے تقاضے کے آگے تج دینا، یہ واقعہ ہجرت کا پیغام اور اس کا پیام ہے۔

لہذا اس روشنی میں ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم نے بھی خدا اور دین کے لئے کچھ قربانی دی؟ ہم نے بھی اپنی خواہشات پر اللہ کو راضی کرنے کے لئے بندش لگائی؟ ہم نے بھی اپنے مال و متاع اور آل اولاد میں سے خدا کی راہ میں کسی کی قربانی دی؟ اگر کبھی ہمارے سامنے حلال و حرام کی کشمکش آئی تو ہم نے حلال کو اختیار کیا یا حرام کو؟ اگر دین پر عمل کرنے کے نتیجے میں ہمیں بظاہر نقصان نظر آرہا ہو تو ہم نے دین پر ہی عمل کیا یا اسے چھوڑ کر دنیا کے وقتی فائدہ کو ترجیح دی؟ ہم نے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات کی رعایت میں کبھی اپنی من چاہی کو قربان کیا؟

حاصل یہ ہے کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام نے دین کی سربلندی کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر مدینہ ہجرت فرمائی تھی ہم نے اپنے اندر دین کے لئے قربانی دینے کا جذبہ کہاں تک اور کس حد تک پیدا کیا؟ اور صرف جذبہ ہی نہیں بلکہ موقع پڑا تو ہم یہ اس قربانی پیش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟ یا خدانخواستہ ہم اپنے اندر یہ جذبہ بھی نہ پیدا کر سکے؟

ہر نیا اسلامی سال ہم سے یہ سوالات کرتا ہے اور ہمیں خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے، اور ہمارے سامنے ہجرت کے واقعہ کی تصویر کھینچ کر ہمیں چودہ سو سال پیچھے ہٹنے پر اور اس کی روشنی میں اپنا جائزہ لینے پر ابھارتا ہے، تو کیا ہم اپنا جائزہ لینے کے لئے تیار ہیں؟

☆☆☆

مولانا سید سلمان حسینی صاحب کا تعزیتی خطاب

پیش کش: محمد فرید حبیب ندوی

نوٹ: ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر مولانا سید سلمان حسینی ندوی دامت برکاتہم تشریف لائے تھے، آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی، مغرب بعد تعزیتی پروگرام ہوا، مولانا نے اس میں بڑا مفصل اور اہم خطاب فرمایا، جسے بہت پسند کیا گیا، خود ڈاکٹر صاحب مرحوم کے گھر میں اسے بار بار سنا گیا، احقر نے اسے تحریری شکل دی ہے، افادۂ کی غرض سے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (م۔ف۔ح۔)

امابعد: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اذکروا محاسن موتاکم، تمہارے جن لوگوں کا انتقال ہوجائے ان کی اچھی باتوں کا تذکرہ کیا کرو اور کسی فارسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

نام نیکے رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامے نیکد پائیدار

تمہارے جو اچھے لوگ گزر جائیں ان کے ناموں کو ضائع مت کرو۔ تاکہ تمہارا نام بھی باقی رہے۔

حضور اکرم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ صحابہ بیٹھے ہوئے تھے، ایک جنازہ گزرا، آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ انہوں نے تعریف کے کلمات کہے، ارشاد فرمایا: وجبت، پھر کسی وقت ایک دوسرا جنازہ گزرا، اور آپ نے پوچھا: تم لوگوں کا کیا کہنا ہے؟ تو ان لوگوں نے اچھی رائے ظاہر نہیں کی، تو فرمایا وجبت، دونوں مرتبہ آپؐ نے فرمایا وجبت واجب ہوگئی، لازم ہوگئی، صحابہ کرام نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب تھا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ایک جنازہ گزرا تو تم نے اس کی تعریف کی، اس کے لئے جنت واجب ہوگئی، ایک جنازہ گزرا تم نے اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں دی، اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی، پھر فرمایا کہ أنتم شهداء الله في الارض تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ مسلمانوں کو یہ حیثیت اللہ نے دی ہے، دوسرے پارہ کے بالکل شروع میں سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا گیا: وكذلك جعلنكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيداً، کہ مسلمانو! ہم نے تم کو بہترین اور درمیانی امت بنا کر اٹھایا ہے تاکہ تم تمام انسانوں کے سامنے حق کی گواہی پیش کرو۔ اور پیغمبر تمہارے سامنے حق کی گواہی پیش کریں۔ پیغمبر کو بھی گواہ بنایا گیا، اور پیغمبر کی پوری امت گواہ بنایا گیا یہ گواہی حق کی گواہی ہے۔ اور حق کی گواہی اس امت کا فریضہ ہے۔ یہ فریضہ نبی پر ڈالا گیا، پھر اس امت پر ڈالا گیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے گواہ ہو، قرآن نے تم کو یہ حیثیت دی ہے، لہذا تم نے جس کے حق میں اچھی گواہی دی، یہ اس بات کی

علامت ہے کہ وہ اچھا ہے، اور تم نے جس کے حق میں بری گواہی دی یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ برا ہے، مسلمانوں کا کسی مسئلے پر اجماع ہونا، مراد اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہیں جو نیک مسلمان ہیں، صالح مسلمان ہیں، صحیح معنی میں مسلمان ہیں، جو اسلام کا فہم رکھتے ہیں، صرف نام کے مسلمان نہیں ہیں، وہ اگر کسی بات پر متفق ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ صحیح ہے، اور اگر وہ اختلاف کرتے ہیں تو اس بات کی علامت ہے کہ وہ غلط ہے، اسی کو فقہاء اجماع کہتے ہیں، شریعت کے دلائل میں سے ایک بڑی دلیل اجماع ہے، مسلمانوں کا اگر کسی بات پر اتفاق ہوجائے، امت کے علماء کا، صلحاء کا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قطعی طور پر وہ بات صحیح ہے، درست ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے تھے کہ مسلمان جس چیز کو بہتر سمجھتے ہیں وہ بہتر ہے، **ما رآہ المسلمون حسناً فھو عندالله حسن**، مسلمان جس چیز کو یعنی مراد وہی ہے مسلمانوں کے نمائندہ علماء، اہل حق، اہل علم، اہل فضل، اہل کمال، قرآن وحدیث پر نظر رکھنے والے، عمل کرنے والے اگر کسی چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ صحیح ہے تو وہ اللہ کے نزدیک صحیح ہے، وہ اللہ کے نمائندہ ہیں، نبی اللہ کی ترجمانی کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ نبی کے صحابہ کو یہ مقام ملتا ہے اور صحابہ کے بعد تابعین کو ملا اور تابعین کے بعد تبع تابعین کو ملا، اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے گا، اللہ تعالی امت میں ایسے لوگوں کو باقی رکھے گا جو حق کی نمائندگی کریں گے۔ فرمایا رسول اکرم ﷺ نے: **لا تزال طائفة من أمتي قائمين على الحق، لا يضرهم من خذلهم إلى قيام الساعة**۔ میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ پوری امت گمراہ ہوجائے، یہ کبھی نہیں ہوگا، ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، سارے لوگ اس کی مدد چھوڑ دیں تب بھی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اس کو یوں فرمایا گیا: **لا تجتمع أمتي على الضلالة ومن شذ شذ في النار**۔ میری امت کبھی گمراہی پر اکٹھا نہیں ہوگی، کچھ لوگ گمراہ ہونے والے ہوں گے اور عوام کی بھیڑ ان گمراہوں کے پیچھے بھی چلے گی جو چوپایوں کی طرح عوام ہے، جن کے پاس نہ عقل ہے نہ علم ہے، لیکن جو صحیح علم رکھنے والے ہیں اور نبی پاک علیہ السلام کے طریقے پر قائم ہیں وہ خود فی نفسہ حجت ہیں، وہ دلیل ہیں، وہ نمائندہ ہیں، تو فرمایا کہ میری امت کبھی گمراہی پر اکٹھا نہیں ہوگی، اور جو امت سے کٹ کر الگ الگ اپنی ڈگر اختیار کرے گا وہ کٹ کر جہنم میں گرے گا۔ اسی لئے یہ بھی فرمایا، **علیکم بالجماعة**۔ اے مسلمانو! اجتماعیت کے ساتھ رہو، الگ الگ اپنی مسجدیں نہ بناؤ، الگ اپنی ڈگر پر مت چلو، فرمایا **واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا**۔ اللہ کی رسی کو ملکر سب لوگ مضبوطی سے تھام لو، اور فرقوں میں مت بٹو، الگ الگ نہ ہو، یہ اس امت کی حفاظت کے انتظامات ہیں، قرآن پاک میں اچھوں کا بھی تذکرہ ہے، بروں کا بھی تذکرہ ہے، انبیاء کا تذکرہ ہے، صلحاء کا تذکرہ ہے، صدیقین کا تذکرہ ہے، صالحین کا تذکرہ ہے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہے، قرآن تو نبیوں کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، نبیوں کے اوصاف، صلحاء کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ ہر مسلمان کو یہ حکم ہے کہ روزانہ کی فرض نماز، سنت نماز، نفل نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھے، یہ وہ سورہ ہے جس کو بار بار پڑھنا ہوتا ہے، اور جس سورہ میں بندہ اللہ کی تعریف کرنے کے بعد، اور یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ ہم اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور اللہ سے مدد چاہتے ہیں، یہ دعا مانگتا ہے، **إهدنا الصراط المستقيم**، اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر پر چلادے، اور سیدھے راستہ پر استقامت عطا فرمادے۔ **صراط الذين أنعمت عليهم** ان لوگوں کے راستہ پر جن پر تو نے انعام فرمایا۔ **غير المغضوب عليهم ولا الضالين**۔

ان کے راستہ پر نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا، اور نہ ان کے راستہ پر جو گمراہ ہو گئے۔

اور وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا؟ فرمایا:

ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين أنعم عليهم من النبين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولاء ك رفيقاً، وہ لوگ کہ جن پر اللہ نے انعام فرمایا، کون لوگ ہیں؟ فرمایا: وہ وہ لوگ ہیں جو انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں، صالحین ہیں، چار طبقات کا نام ذکر کیا گیا، سر فہرست ظاہر ہے کہ انبیاء ہیں، ان سے انسانوں میں کوئی بھی بڑا نہیں ہے، اور انبیاء کے بعد درجہ صدیقین کا ہے، اور صدیقین وہ ہیں کہ جن کے دل شکوک سے، شبہات سے پاک ہیں، اور وہ جو انبیاء کرام کی دعوت پر پہلے ہی مرحلہ میں لبیک کہتے ہیں، جو صداقت، اور امانت اور دیانت پر قائم رہتے ہیں، جن کی زندگی میں کبھی کسی بھی دور میں دوغلا پن نہیں ہوتا ہے، ایسے سچے کھرے لوگ صدیقین کہلاتے ہیں، ان میں سرِ فہرست حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں، نبی اکرمؐ کو انہوں نے مانا، بغیر کسی تردد کے اور بغیر کسی شک وشبہ کے، بغیر کسی تاخیر کے، پہلے سے وہ رفیق تھے، ساتھی تھے، دوست تھے، اور جب نبوت کا تذکرہ آپؐ نے فرمایا تو ان کو دیر نہیں لگی، اور پھر تیسرے نمبر پر ذکر فرمایا گیا شہداء کا، وہ لوگ کہ جو شہید ہوتے ہیں، اور شہید وہ ہے جو گواہ ہے، اور پھر یہ شہید وہ ہے جس نے اللہ کی حقانیت اور دین کی سچائی کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے، اس کی گواہی دیتے ہوئے، اپنی جان دی، یہ وہ شہید ہے، ظاہر ہے کہ سب سے بڑا شہید، سب سے بڑا گواہ دنیا میں وہ ہے، جو اس گواہی کی خاطر اپنی جان نچھاور کر دے۔ اس لئے اس کا مرتبہ بہت بڑا ہے، اگرچہ انبیاء کے بعد ہے، اگرچہ صدیقین کے بعد ہے، ان کے مرتبے اور سوا ہیں، لیکن بہرحال پھر اس کا مرتبہ ہے۔

اور یاد رکھیے کہ نبی اکرمؐ نے شہداء کی فہرست بڑی لمبی فرمادی، ایک تو وہ ہے جو جہاد کرتے ہوئے، میدان میں دشمنوں سے ٹکراتے ہوئے شہید ہوتا ہے، پھر نبی پاک علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کہ اگر پیٹ کی تکلیف میں، مرض میں کوئی شخص انتقال کر جائے وہ شہید ہے، اور کسی پر دیوار گر جائے، چھت گر جائے، اور اس طرح سے وہ ختم ہو جائے تو وہ شہید ہے، اور کوئی اگر ڈوب کر مر جائے تو وہ شہید ہے، کوئی جل جائے تو وہ شہید ہے اور اس کے علاوہ اس فہرست میں متعدد لوگ ہیں جو ان تکلیفوں کے ساتھ، طاعون کی بیماری ہوگئی، اور اس طرح کی بیماریاں لا علاج نوعیت کی ہوگئیں، جنہیں سہتے ہوئے دنیا سے چلے گئے، وہ شہید شمار کیا گیا ہے احادیث میں، اور اس اعتبار سے، اللہ سے امید ہے کہ ہمارے ڈاکٹر صاحبؒ بھی شہداء میں ہیں، اس لئے کہ حضور اکرمؐ نے ایک طرف تو اصل، نمبر ایک پر شہید اس کو فرمایا جو میدان جہاد میں اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر، اگر وہ جہاد میں سرگرداں ہے، لڑ رہا ہے، لیکن قوم کی نیت ہے، اپنی عزت کی نیت ہے، زمین کے لئے وطن کے لئے، دنیا کے لئے لڑ رہا ہے تو اس کا جہاد جہاد نہیں ہے، خالص اللہ کے لئے اگر اس دین پر قائم ہے، دین کی فکر میں لگا ہے، اور اسی پر اپنی زندگی گزار رہا ہے، اور اس کے بعد اس طرح کے کسی حادثہ میں یا کسی تکلیف میں، جو تکلیف بڑی سخت ہوتی ہے اور انسان اس سے گزرتا ہے، تو اس کو بھی نبی پاکؐ نے شہداء کے مرتبہ پر رکھا ہے، اور اس سلسلہ میں متعدد حدیثیں، بخاری میں، مسلم میں، ترمذی میں، مختلف کتب حدیث میں موجود ہیں، اور جو فہرست اس میں بیان فرمائی گئی ہے وہ محدود نہیں ہے، اور مثالوں کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے کہ سخت قسم کے حالات سے گزرنے والا جو انسان ہے، آپؐ نے اس کو بھی یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے، اس لئے اللہ کی طرف سے عجیب معاملہ ہے، یہ فرمایا گیا ہے احادیث میں کہ جو ابتلاء اور آزمائش کے

ساتھ، اور تکالیف کے ساتھ دنیا سے جاتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ وہ مرتبے دیتا ہے، جو عافیت والوں کو نہیں ملتے، اور فرمایا گیا حدیث میں کہ جن کی عافیت سے زندگی گزرتی ہے اور بغیر تکلیف کے دنیا سے چلے جاتے ہیں جب آخرت میں وہ دیکھیں گے کہ جو آزمائشوں سے گزرے، تکلیفوں سے گزرے، ان کو اللہ کی طرف سے کتنا نوازا جا رہا ہے، کتنی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے، تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کاش کہ ہماری کھالوں کو ادھیڑ دیا جاتا اور قینچیوں سے کاٹ دیا جاتا تو ہم بھی آج یہ مرتبہ پاتے۔

یہ احادیث میں جو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، وہ یہی سمجھانے کے لئے کہ یہ کبھی نہ سمجھنا چاہیے کہ عافیت اگر کسی کو ملی ہوئی ہے تو یہ علامت ہے کہ اس سے اللہ راضی ہے، اگر وہ اچھا ہے نیک ہے ایمان والا ہے تو یقیناً اللہ راضی ہے، لیکن جو آزمائشوں سے گزر رہا ہے، اور بالخصوص مرض الوفات میں اس کو آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے تو یہ آزمائشیں اس کے لئے تزکیہ کا سبب ہیں، تطہیر کا سبب ہیں، تکفیر سیئات کا سبب ہیں، رفع درجات کا سبب ہیں، نبی پاک علیہ الصلوۃ والسلام کی وفات بڑی تکلیف کے ساتھ ہوئی، عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ بخار اتنا سخت تھا، اتنا سخت تھا، کہ پیالے میں پانی رکھا تھا، آپؐ اس میں ہاتھ ڈالتے تھے، چہرے پر لگاتے تھے اور جس دن آپ کی یہ حالت تھی کہ اٹھنا چاہتے تھے عشاء کی نماز کے لئے، اٹھ نہیں پاتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ ذرا پانی لاؤ، جسم پر گرمی ایسی تھی کہ آپ نے سات مشکیزوں سے نہایا، لیکن پھر بھی نہیں اٹھ سکے تو فرمایا کہ ابوبکر سے کہہ دو کہ وہ نماز پڑھائیں، اس وقت سے ابو بکر صدیقؓ نے نمازیں پڑھانا شروع کیں اور اکیس نمازیں انہوں نے پڑھائی تھیں کہ نبی پاکؐ دنیا سے رخصت ہو گئے، تو عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ اب مجھے کسی شخص پر اس بنیاد پر رشک نہیں آتا کہ مزے میں اس کی موت ہو گئی، کوئی تکلیف نہیں، اس لئے کہ میں نے دیکھا کہ حضور پاکؐ تکلیفوں سے گزرے۔ اور آپ کو جب تکلیفیں شروع ہوئیں تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ یہودی عورت زینب کے زہر دینے کا اثر ہے، جب خیبر فتح ہوا تھا تو اس عورت نے چالاکی کے ساتھ دعوت کے لئے بلایا تھا اور آپ چونکہ غریبوں اور کمزوروں کی دعوت قبول فرما لیتے تھے، اور اس نے سازش میں زہر ملایا تھا، کھانے میں، گوشت میں، اور خاص طور پر جو گوشت آپ کو کھانا تھا اس میں زیادہ زہر تھا، صحابہ بیٹھے تھے اور ایک صحابی حضرت براء نے ذرا جلدی سے منہ میں لقمہ لیا اور اس کو نیچے اتار لیا، حضور نے جیسے ہی منہ میں لقمہ لیا فوراً متنبہ ہو گیا تو آپ نے اس کو تھوک دیا اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ اس میں زہر ہے، اور سب نے ہاتھ روک لئے، بعد میں وہ صحابی انتقال کر گئے تھے کیوں کہ ان کے جسم میں تو زہر چلا گیا تھا، حضور پاکؐ محفوظ رہے لیکن اس کا اثر زبان کے ذریعہ پہنچا، اتنا کہ یہ سن ۷ ھ کا واقعہ ہے، تو جب آپ کی وفات کا وقت قریب تھا تو آپ فرماتے تھے کہ جو زہر میرے منہ میں گیا تھا آج تک میں اس کی تکلیف محسوس کر رہا ہوں اور اسی تکلیف سے آپ کی وفات کا واقعہ پیش آیا، حضرت عائشہ صدیقہؓ جو آخری دور میں آپ کی تیمار داری کر رہی تھیں اور آپؐ ہی کے گھر میں حضورؐ آخری وقت میں رہے، آخری وقت تک رہے۔ ایک طرف تو ان کا یہ بیان ہے اور ایک حدیث میں فرمایا گیا: أشد الناس بلاء آ الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل۔ سب سے زیادہ کڑی آزمائش نبیوں کی ہوتی ہے، پھر درجہ بدرجہ، سب سے بڑی آزمائش پوری دنیا میں واقعہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی ہوئی، ساڑھے نو سو سال تک دعوت و تبلیغ میں رات و دن لگے رہے اور قوم کو مخاطب کرتے رہے، تنہائیوں میں بھی، مجمعوں میں بھی اور اپنے گھر والوں سے بھی اور باہر والوں سے بھی، یعنی حیرت ہوتی ہے کہ ایک آدمی سے دس مرتبہ بات کرنے کے بعد

آدمی اکتا جاتا ہے کہ کتنا کہیں، لیکن کیا کلیجہ تھا، کیا طاقت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی تھی، کہ مزاق اڑایا جارہا ہے، پھبتیاں کسی جارہی ہیں، جملے کسے جارہے ہیں، تکلیفیں دی جارہی ہیں، لیکن بس وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے، وہ کام ہے، کوئی ہدایت پارہا ہے یا نہیں، کوئی آدمی ان کے حلقے میں داخل ہورہا ہے یا نہیں، یہ بحث ہی نہیں ہے، بحث صرف یہ ہے کہ ہم اللہ کی طرف سے مامور ہیں، جو کام ہمیں سونپا گیا ہے وہ کرتے رہنا ہے، کرتے رہنا ہے، اللہ کے ملازم ہیں ہم، اللہ کے بندے ہیں، اللہ کے غلام ہیں، ہمیں امر الٰہی دیکھنا ہے، تو بہر حال انبیاء کرام کا بہت بلند مقام ہے، اس کے بعد حسب درجات مقامات ہوتے ہیں، اور جو ترتیب بیان فرمائی گئی ہے ان لوگوں کی جن پر اللہ کا بڑا انعام ہے اور جن کے سلسلے میں آپ دعاء مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو ان کے راستے پر چلا دے۔ چوتھے نمبر پر ہیں صالحین، صالحین وہ لوگ ہیں جو اپنے عمل کو درست رکھتے ہیں، شریعت کو میزان بناتے ہیں، ایمان پر قائم رہتے ہیں، استقامت کی فکر کرتے رہتے ہیں، کوئی گناہ ہوتا ہے تو توبہ کر لیتے ہیں، استغفار کرتے ہیں، اسلامی شریعت کی پابندی کرتے ہیں فرائض کا اہتمام کرتے ہیں، واجبات میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں، سنت کی فکر میں رہتے ہیں، نوافل سے غافل نہیں ہوتے ہیں، اللہ کی یاد میں لگے رہتے ہیں، ذکر لسانی کرتے ہیں، ذکر قلبی کا اہتمام کرتے رہتے ہیں، اور خیر و شر میں تمیز کرتے ہیں، لوگوں کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرتے ہیں، یہ صلحاء ہیں، یہ اللہ کے نیک اور صالح بندے ہیں، یہی ہیں جن کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے، فرمایا گیا قرآن پاک میں: **ألا إن أولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون الذين آمنوا وكانوا يتقون۔** فرمایا: کہ لوگو! سن لو کہ اللہ کے جو ولی ہیں ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا۔ ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ان کو کوئی رنج نہیں ہوگا۔ ان کو کوئی غم نہیں ہوگا۔ وہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور تقوی اختیار کرتے ہیں۔ **الذين آمنوا وكانوا يتقون۔** اولیاء وہ نہیں ہیں یا اولیاء کے بارے میں یہ سمجھنا کہ جن کے ذریعہ سے کرامتیں ظاہر ہوں، ہوا میں اڑیں پانی پر چلیں، بلا اسباب کے اسباب پیدا کریں، لوگ سمجھتے ہیں کہ جو یہ کرامتیں دکھائیں وہی ولی ہیں، یہ بالکل غلط ہے، ہوسکتا ہے کہ ایسا دکھانے والا یا جس کے ذریعہ سے یہ چیزیں وجود میں آرہی ہیں اس پر استدراج ہورہا ہو، وہ بگڑا ہوا آدمی ہو، فتنے کا شکار ہو یا فتنہ پرور ہو، اس لئے جو قرآن پاک میں علامتیں بتائی گئیں وہ: **الذين آمنوا وكانوا يتقون۔** جو مومن ہیں اور تقوی اختیار کرنے والے ہیں، اور تقوی صرف یہ ہے کہ حلال پر قناعت اور حرام سے بچنا، مشتبہ سے بھی بچنے کی کوشش کرنا اور حرام سے بالکل بچنا اور شر سے اپنے کو بچانا، خیر کو اختیار کرنا، ایسے لوگ اللہ کے ولی ہیں۔

ہمارے ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب بھی اللہ کے ولی تھے، اولیاء اللہ کی جو صفات قرآن میں بیان کی گئیں الحمد للہ بدرجۂ اتم ان میں موجود تھیں، اور سب سے بڑی چیز جس کی اللہ کے یہاں بڑی قدر ہے وہ حقوق العباد ہے، اللہ کے حقوق کا جہاں تک تعلق ہے جو حقوق اللہ کہلاتے ہیں، اللہ کی عبادت، تو اللہ میاں اس کے معاملہ میں بہت ہی رعایت فرماتے ہیں، بہت معاف فرماتے ہیں، وہ عفو کریم ہیں، وہ غفار ہیں، ستار ہیں، رحمٰن ہیں، لیکن بندوں کے حقوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بندوں ہی کے ذمہ کر دیا ہے، وہ اگر معاف کرتے ہیں تو معاف، اگر نہیں معاف کرتے ہیں تو مطالبہ اور محاسبہ، جو اللہ کے بندے صاحبِ اخلاق ہوتے ہیں، اچھے معاملات کے ہوتے ہیں، اچھی گفتار ہوتی ہے، اچھا کردار ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں وہ سب سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں، سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ، ان پر کرم فرماتا ہے، ان پر رحم فرماتا ہے، جن کا لوگوں

کے ساتھ معاملہ اچھا ہوتا ہے، اخلاق کا ہوتا ہے، کرم کا ہوتا ہے، رواداری کا ہوتا ہے، نیک نامی کا ہوتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں، میں بھی بہرحال اس کا سو فیصد گواہ ہوں کہ ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب رحمۃ للہ علیہ اسلامی اخلاق کا ایک بہترین پیکر تھے، بہت سی اور صفات اور خصوصیات ہوتی ہیں، ان میں، لوگوں کے درمیان درجات ہوتے ہیں، اور مقامات ہوتے ہیں لیکن جہاں تک مسئلہ ہے انسانیت کا، اور اخلاق کا اور نرمی کا، اور اکرام کا، اس میں وہ فرد فرید تھے، نادر لوگ آج کی دنیا میں نادر الوجود لوگ ایسے ہوتے ہیں، آج ایک سے ایک ایمان کا دعویٰ کرنے والے، اور ایک سے ایک دین کے کاموں میں لگے ہوئے افراد ہیں کہ جن کا لوگوں کے ساتھ معاملہ صحیح نہیں ہوتا، لوگوں کے ساتھ معاملہ میں بڑے کھُرّے اور بڑے سخت مزاج واقع ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے گھر والوں کے لئے سخت ہوتے ہیں، اوروں کے لئے بھی تکلیف کا ذریعہ بنتے ہیں، اگر چہ بڑی عبادت کرتے ہیں، بڑی تسبیح کرتے ہیں، ایسے لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں، اللہ کو زیادہ وہ لوگ پسند ہیں جو لوگوں کے زیادہ کام آئیں، لوگوں کا زیادہ خیال کریں، اور لوگوں کا زیادہ اکرام کریں، تو جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھ سے عمر میں وہ بڑے تھے، وہ میرے سینئر تھے، لیکن میرے ساتھ جو ان کا رویہ تھا وہ بے انتہا نرمی کا، محبت کا، نرم مزاجی کا تھا، ضیافت میں بھی وہ فرد فرید تھے، نرمی اور اخلاق میں ایک اچھے مؤمن اور اچھے مسلمان اور اسی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اسلامی اخلاق کا بہترین نمونہ تھے، یہ بہت بڑی نعمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی اور یہ وہبی تھی، اس میں کسب سے زیادہ وہب کو دخل تھا، اور اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کسی بندہ کو یہ نعمت عطا فرمادے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کو قبول کیا گیا، اللہ کی طرف سے اس کو جو کام سونپا گیا اس کام میں منظوری دے دی گئی، تو یہ بہت بڑی نعمت تھی، اور اللہ تعالیٰ یقیناً اس بنیاد پر اعلیٰ ترین جزاؤں سے ان کو نوازے گا۔

صالحین کی جو صفات ہیں، ایمان پختہ، اچھے اعمال، سنت کی پیروی، لوگوں کے ساتھ اچھا رویہ، خوش خلقی کے ساتھ معاملہ، اور ہر ہر انسان کا خیال، ہر انسان کا خیال، صرف یہ نہیں کہ جو مشہور ہیں اور بڑے ہیں، ان کا خیال، کسے باشد، یہ ایک ہنر ہے، ایک جوہر ہے، یہ انسان کا ایک ہیرہ ہے، اخلاق کا ایک ایسا کوہ نور ہے کہ جس کو یہ حاصل ہوتا ہے، اس کی زندگی بڑی روشن ہوتی ہے اور اچھی ہوتی ہے، اس کا لوگوں کے ساتھ جو معاملہ ہے، وہ اللہ کے ساتھ اچھے سے اچھے معاملہ کا ذریعہ بنتا ہے، اور حضور پاکؐ سے بعض موقع پر صحابہ کرام نے یہ سوال کیا کہ حضورؐ اعلیٰ درجہ کا اسلام کیا ہے، تو آپؐ نے فرمایا حسن الخلق، اچھے اخلاق، اعلیٰ درجہ کے اسلام، افضل ترین اسلام کے بارے میں جب آپ سے سوال کیا گیا کبھی آپؐ نے اور جوابات بھی عنایت فرمائے حسب ضرورت، لیکن یہ بھی فرمایا بعض موقعوں پر حسن الخلق، اچھے اخلاق، اور ظاہر ہے کہ اچھے اخلاق چاپلوسی کو نہیں کہتے ہیں، دکھاوے کو نہیں کہتے ہیں، نمائش کو نہیں کہتے ہیں، ایک تجارتی اخلاق ہوتے ہیں، ایک اخلاق ہوتے ہیں انسان کی اچھی صفت اور اچھی طبیعت، اس کے تعلق مع اللہ اور اس کی خیر طلبی کی بنیاد پر اندر سے پیدا ہوتے ہیں، سرچشمہ ان اخلاق کا اندر ہوتا ہے، وہ اخلاق کمرشیل نہیں، وہ تجارت کے لئے نہیں ہوتے، وہ دین کی بنیاد پر ہوتے ہیں، انسانی مزاج اور طبیعت کے مطابق ہوتے ہیں۔

بہرحال جو شخصیت گذر گئی وہ ایک ایسی نادر الوجود شخصیت تھی کہ شاید و باید، بہت کم لوگ، یعنی میں دنیا میں بہت پھرتا رہتا ہوں اور ملکوں میں بھی جاتا ہوں، اس ملک میں بھی جگہ جگہ جاتا ہوں، میں نے اس طرح کے افراد شاذ و نادر دیکھے، بڑے بڑے

فضلاء دیکھے، اہل علم دیکھے، اور ڈاکٹرس دیکھے لیکن، انسانی اقدار کا درس تو آسان ہے لیکن انسانی اقدار سے متصف ہونا اور انسانی اقدار کا مجسمہ پیش کر دینا اور خود انسانی اقدار کا پیکر بن جانا بہت مشکل ہے، تو یہ بات اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان کو عطا فرما رکھی تھی اور اس کا ان کی زندگی پر اثر تھا، ان کی صفات بھی الحمد للہ مؤمنانہ اور صالحانہ تھیں، اور نہایت ہی خوبیوں کے ساتھ یہ چیز ان کے اندر نمایاں ہوتی تھی، لیکن اس کے اثرات انشاء اللہ بڑے دیرپا بھی رہتے ہیں، اس کے اثرات دائم وقائم رہتے ہیں، اللہ کی طرف سے ایسی برکتیں عطا ہوتی ہیں کہ پھر اس کے نتیجہ میں اسلاف کے اخلاق بھی بہتر ہوتے ہیں، پسماندگان کو اللہ نوازتا ہے، خاندان کو اللہ کی طرف سے نوازا جاتا ہے، کوئی کام شروع کیا ہے اس میں برکتیں ہوتی ہیں، اس میں بقاء ملتا ہے، اس کو ترقی نصیب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی زوال سے حفاظت فرماتا ہے اور غیب سے ایسے ایسے انتظامات ہوتے ہیں کہ آدمی پھر ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، یہ اللہ کا معاملہ ہوتا ہے صلحاء کے ساتھ، صلحاء جب موجود ہوتے ہیں تو ہوتے ہیں، نہیں موجود ہوتے تو ان کے اثرات قائم رہتے ہیں، قرآن پاک میں اللہ نے انبیاء کا جہاں تذکرہ فرمایا اور خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کا تو ان کی عقب میں اور ان کے ما بعد جو برکات ظاہر ہوتی چلی گئیں، ہوتی چلی گئیں، وہ سب ان کی دعاؤں کا اور اعمال کا نتیجہ تھیں، ان کے ایمان کے اثرات تھے، اللہ نے ان کا تذکرہ فرمایا اور اس کے بعد یہ بات تمام صلحاء اور تمام اولیاء کے ساتھ فرمائی گئی، قرآن پاک میں آپ جانتے ہی ہیں کہ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت خضر حضرت موسیٰ کو لے کر ایک بستی میں گئے اور اس بستی میں انہوں نے دیکھا کہ ایک مکان ایسا ہے جس کی دیوار اب گری اور تب گری تو وہ وہاں ٹھہرے اور اس کے بعد اس دیوار کے لئے مستری بن گئے اور اس کی دیوار درست کرنے لگے، اس کو ٹھیک ٹھاک کر دیا، حضرت موسیٰ کو بڑا تعجب ہوا کہ جان نہ پہچان اور اس بستی کے لوگوں نے کوئی خاطر بھی نہیں کی لیکن ان کی خاطر یہ مزدور مستری بن کر دیوار درست کر رہے ہیں، تو انہوں نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو حضرت خضر نے بعد میں جو تین واقعات پیش آئے تھے ان کی تفصیلات بیان کیں تو اس کے بارے میں یہ کہا کہ اصل میں یہ دو بچے ہیں، ان کے والد صاحب اچھے نیک آدمی تھے، اب یہ یتیم بچے ہیں اور اس دیوار کے نیچے خزانہ گڑھا ہوا ہے اگر یہ دیوار گر جاتی، خزانہ کھل جاتا تو یہ گاؤں والے لوٹ لیتے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا، تو ہم نے یہ انتظام کر دیا ہے، یہ بچے جب بڑے ہو جائیں گے اور اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے مسائل سنبھال سکیں تو پھر یہ خزانہ ان کے ہاتھ لگے گا، ان کے یہاں وصیت موجود ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھالیں گے، لیکن آج اگر دیوار گرتی تو خزانہ ختم ہو جاتا، والد کی جو نیکی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے یتیم بچوں کی حفاظت کے لئے حضرت خضر کو بھیجا، حضرت موسیٰ نبی اور حضرت خضر ولی دونوں اس بستی میں گئے دیوار بنانے کے لئے، کیسے کیسے انتظامات ہوتے ہیں آدمی کا خیال بھی نہیں جا سکتا، غیب کی طرف سے کس کے لئے کیا انتظام اللہ کرتا ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے، تو نیک لوگوں کی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک زمانہ تھا کہ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے رہتے تھے اور اس کے بعد جب خلافت ان کو سونپی گئی تو بس پھر وہ عمر بن الخطاب کی طرح بن گئے، ساری دولت اللہ کے راستہ میں لٹادی، اپنی زندگی قربان کر دی، اپنی بیوی کے زیورات بیت المال میں جمع کر دئے اور نوبت یہ آگئی کہ ان کی اولاد کا یہ حال تھا کہ جب انتقال ان کا ہوا تو ان کے پاس کچھ پیسہ کوڑی نہیں تھا، آخر آخر میں جب وہ اسپین سے لے کر چائنا تک دنیا

کے ملکوں کے مالک تھے، خلیفہ تھے، اس وقت گھر میں کبھی سالن سے روٹی کھالی جاتی کبھی لڑکیاں منہ پہ ہاتھ رکھے ہوتیں، اس لئے کہ انہوں نے پیاز سے روٹی کھائی ہوتی تھی کہ ابا کو کہیں بو نہ محسوس ہوجائے، یہ ان کے بیٹوں کا حال تھا جو خلیفہ تھے، دوسری طرف ہشام بن عبدالملک کو شوق تھا عمارتیں بنانے کا اور پیسے جمع کرنے کا، بے تحاشہ دولت اور ہر ہر بیٹے کو لاکھوں کروڑوں کی دولت دی، اور پھر وہ دنیا سے گیا اور یہ دنیا سے گئے، مؤرخین کا بیان ہے کہ ہشام کی اولاد میں بگاڑ پیدا ہوا، اور یہ دیکھا گیا کہ اس کے لڑکے بھیک مانگ رہے ہیں، عمر بن عبدالعزیز کچھ چھوڑ کر نہیں گئے اور دیکھا گیا کہ ہر لڑکا بڑی عزت کی، وجاہت کی زندگی بسر کررہا ہے، یہ انتظام اللہ کی طرف سے تھا، اور یہ انتظام صلاح کی وجہ سے، نیکی کی وجہ سے، تقوی کی وجہ سے، احتیاط کی وجہ سے تھا، جب آدمی حرام سے بچے گا تو اللہ اس کی اولاد میں برکتیں عطا فرمائے گا، اس کے مال میں برکتیں ہوتی چلی جائیں گی، یہ اللہ کی طرف سے انتظامات ہوتے ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے ہیں لیکن عالم غیب میں فرشتے اسی کے لئے تعینات ہیں، تو نیکیاں ضائع نہیں جاتیں، جو بھی نیکی ہو، نیکی کا تو معاملہ یہ ہے کہ آدمی نے کوئی پودہ لگادیا ہے یہ درخت بنے گا اور اس درخت میں پھل لگیں گے، جو پھل کھائے گا، اس کا جو سایہ لے گا، کوئی پرندہ بھی اگر چونچ مار کے پھل سے کچھ کھائے گا تو اللہ اس کا ثواب بھی اس شخص کو دے گا جس نے درخت لگایا، جس اللہ کے کرم کا یہ معاملہ ہے، کہ آپ نے چھوٹا سا بھی کام کردیا، کوئی ایسا صدقہ، کوئی ایسا عمل جو جاری وساری رہنے والا ہے ختم ہونے والا نہیں ہے تو اس کی برکات لازوال ہیں، اس کا ثواب انمٹ ہے، ملتا ہی رہے گا، اسی کو صدقہ جاریہ کہتے ہیں، ایک ایسا خیر جو جاری رہے، حضور پاکؐ نے فرمایا تھا، اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث إلا من صدقة جارية أو ولد صالح يدعو له أو علم ينتفع به فرمایا کہ انسان کا جب انتقال ہوتا ہے تو سلسلۂ عمل ختم ہوجاتا ہے، اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہوگیا لیکن اس کے اثرات ختم نہیں ہوتے، فرمایا جو صدقہ جاریہ کردیا اس نے، جو خیر کا کام کردیا، مدرسہ بنادیا، مکتب قائم کردیا، مسجد بنادی، کوئی چشمہ جاری کردیا، کوئی ہینڈ پمپ لگادیا، کوئی کنواں جاری کردیا، کوئی بھی خیر کا کام، اس سے جو بھی مستفیض ہوگا اس کا ثواب اسے ملتا رہے گا اور اچھی اولاد پیچھے چھوڑی جو اس کے لئے دعا کرے، یہ ایک بڑی نعمت ہے، کہ اس اولاد کی جو دعائیں ہیں، اس اولاد کے جو نیک اعمال ہیں ان نیک اعمال کا ثواب اولاد کو ملے گا اور ساتھ ساتھ باپ کو بھی ملتا رہے گا، باپ ذریعہ بنا، جیسے اس نے درخت لگایا، جسے اس نے اور کوئی کام کیا، ایسے ہی اولاد کی تربیت کی، اس تربیت کے جو اثرات ہیں، جو ثمرات ہیں، ان ثمرات سے وہ خود بھی مستفیض ہوں گے، ان کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں خزانہ غیب سے والد کے لئے بھی ثواب جاری وساری رہے گا۔

تیسرے نمبر پر فرمایا وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، لوگوں کے لئے نفع ہو، دین کو اس سے ترقی ملے، اللہ کے دین کے کام کو نصرت ملے، جو بھی ایسا علمی کام کردیا، کتاب لکھی، مدرسہ قائم کردیا، اساتذہ رکھے، طلباء کا انتظام کیا، یہ ایسا لامتناہی خیر ہے جس کو گنا نہیں جاسکتا، جس کا کوئی کیلکولیشن نہیں، اور یہ مسلسل جاری ہے، مسلسل، جس ایک نے پڑھا، اس نے دوسروں کو پڑھایا انہوں نے اوروں کو پڑھایا، وہ حساب بٹتا ہی چلا جاتا ہے، فرمایا رسول اکرم ﷺ نے: ابن آدم کا انتقال ہوتا ہے، عمل منقطع ہوتے ہیں لیکن صدقہ جاریہ باقی رہتا ہے، نیک اولاد جو دعا کرتی ہے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اور وہ علم جس کو وہ چھوڑ کر گیا ہے، کسی بھی شکل میں، اس کا بھی ثواب ملتا رہتا ہے، ماشاء اللہ کیا کہنے، کہا کہنے ہمارے ڈاکٹر صاحب کے، کہ یہ تینوں ہی نعمتیں انہیں

حاصل تھیں، تو یہ وہ حقائق ہیں قرآن پاک کے، احادیث نبویہ کے، جن پر انسان غور کرتا چلا جائے تو اس کے سامنے خدا کی رحمت کے دریا موجزن نظر آئیں گے، اور وہ دیکھتا چلا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس کس طرح کے انعامات ہیں، کیسی نعمتیں ہیں، ظاہر ہے کہ وہ الرحمٰن ہے، الرحیم ہے، یہ اس کی صفت سب سے زیادہ غالب ہے، اس نے فرمایا سبقت رحمتی غضبی میری رحمت میرے غضب سے آگے آگے ہے، اللہ کی رحمت کا ہی زیادہ تر ظہور ہے، وہ کبھی ناراض ہوتا ہے، کسی پر ناراض ہوتا ہے، اس کے اسباب ہیں، لیکن رحمت غالب ہے، اور اسی لئے قرآن پاک کی ہر سورہ سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، پڑھو اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے اور رحیم ہے، جس کی رحمت میں بڑا جوش ہے، بڑی فراوانی ہے، اور جس کی رحمت میں دوام ہے، اور بقا ہے، رحیم میں دوام اور بقاء کے معنی ہیں اور رحمٰن میں جوش اور فروانی کے معنی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور اللہ کی رحیمیت، اور اللہ رؤوف ہے، اللہ ستار ہے، عیبوں کو چھپاتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ذلیل ہو، کوئی آدمی اپنے کو ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہو، تو بات الگ ہے کہ وہ اللہ کی چادر ہی پھاڑ دیتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ سب کے گناہ چھپائے ہوئے ہے، سب کو ڈھکے ہوئے ہے، کسی کو بھی خدا تعالیٰ ذلیل نہیں کرتا ہے۔ یہ انسان ہے جو بار بار جرم کر کے اپنے کو ایسا کر دیتا ہے کہ خدا کی چادر رحمت کی پھاڑ دیتا ہے، ورنہ وہ غفار ہے، وہ ستار ہے، وہ رحمٰن ہے، وہ رحیم ہے، وہ تو بہانے دیکھتا ہے، رحمت کے لئے بہانے، ادنی سی کوئی بات، آپ نے وضو کیا، فرمایا جو وضو کرتا ہے صحیح طور پر، اس کے سارے گناہ، ہاتھ کے، سر کے، منھ کے معاف ہو جاتے ہیں، نماز پڑھتا ہے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جمعہ پڑھا تو ایک ہفتہ کے لئے جمعہ سے جمعہ تک کے گناہ معاف ہو گئے، رمضان صحیح طور پر گذارا، روزے رکھے، اس کا حق ادا کیا، سال بھر کے گناہوں کو معاف کر دیا گیا، عرفات کے دن روزہ رکھا تو ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف کر دئے گئے، کس قدر فضائل ہیں، اعمال کے فضائل ایسے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کی بھرمار ہے، نعمتوں کی بوچھار ہے، موسلا دھار بارش ہے، پھر بھی کوئی محروم رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بھئی اس نے اپنی قسمت پھوڑ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے، الحمد للہ اس اعتبار سے ہمارے بھائی ڈاکٹر غیاث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوئی شک نہیں کہ رحمۃ اللہ علیہ کے رسمی طور پر نہیں حقیقی طور پر مستحق ہیں، بے شک اللہ کی رحمتوں کی آغوش میں ہیں، حدیث پاک میں فرمایا گیا، کہ ایمان والے کی جب جان کے نکلنے کا وقت آتا ہے، آخری وقت ہوتا ہے، تو رحمت کے فرشتے آتے ہیں، جنت کا، ریشم کا ایک کپڑا لے کر جس میں انہیں روح لے جانا ہے، اور مومن بندہ جب انہیں دیکھتا ہے، تو بس شوق میں چاہتا ہے کہ پرواز کروں، اس کی روح نکلنے کے لئے بیتاب ہوتی ہے، اور پھر وہ اس کی روح کو سہولت کے ساتھ نکال کر لے جاتے ہیں، اور جب لے جاتے ہیں تو آسمان میں فرشتوں کی طرف سے ایک ہنگامہ ہوتا ہے کہ بھئی کس کی روح آئی ہے، اتنی خوشبو پھیل رہی ہے، ہر طرف خوشیوں کا عالم ہے، وہ کہتے ہیں کہ مؤمن بندہ کی روح ہے، اور اسے اعلی علیین میں جگہ دی جاتی ہے۔

ایک طرف تو اس کی روح کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے، اور یہی روح ہے جس کے کرنٹ سے آنکھوں میں چمک ہے، دماغ میں سوچ ہے، دل میں دھڑکن ہے، نبض چل رہی ہے، تو یہ کرنٹ ہے، یہ سرالٰہی ہے، رازالٰہی ہے، آج تک دنیا کی سائنس نے اس راز کو نہیں پایا، دنیا تھک گئی سوچتے سوچتے اور طرح طرح کی باتیں کی گئیں، لیکن روح کے راز کو نہ پہلے کسی نے پایا نہ آج کوئی پا رہا ہے نہ کبھی کوئی پائے گا، قرآن میں فرمایا گیا، یسئلونك عن الروح۔ اے نبی! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے

میں، قل الروح من أمر ربی کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا ایک حکم ہے، فیصلہ ہے، ایک فرمان ہے، وما أوتیتم من العلم إلا قلیلا۔ اور جو علم تمہیں دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے، بہت کم ہے، تم اپنے اس علم پر اگر چہ ناز کرتے ہو مگر کچھ بھی نہیں، ذرہ بھی نہیں، ریگستان کا ذرہ نہیں، یہ سمندروں کا ایک قطرہ نہیں، اس علم کو بہت سمجھ لیتے ہو، تو فرمایا یہ کہ ایک راز ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ راز ایسا ہے کہ کوئی بیماری کا محتاج ہے، کوئی بیماری کی وجہ سے جارہا ہے، کوئی بغیر بیماری کے جارہا ہے، کوئی سوتے سوتے رخصت ہورہا ہے، کوئی جاگتے جاگتے رخصت ہورہا ہے، بیٹھے، کھڑے، لیٹے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، لحہ بہ لحہ ہر شخص کے لئے انتظار ہے، کہ کب اس کی روح پرواز کرے گی، اور اللہ کی طرف سے وقت طے ہے، بالکل طے، جب انسان جنین ہوتا ہے، ماں کے پیٹ میں تو حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ جو فرشتہ متعین ہے ان کاموں کے لئے اور وہ ظاہر ہے کہ ایک نہیں لاکھوں فرشتے ہیں، جو جبرئیل امین کی ماتحتی میں، میکائیل و اسرافیل اور عزرائیل کی ماتحتی میں اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر لگے ہوئے ہیں، کوئی فرشتہ ہے جو روح، سرالٰہی کو لاکر ڈالتا ہے اور اسی دن طے کردیا جاتا ہے کہ اس کی عمر کے کتنے لمحات ہوں گے، کوئی پہلے نہیں جاتا، کوئی بعد میں نہیں جاتا، یہ صرف آپ کی زباں دانیاں ہیں، یا زباں درازیاں ہیں یا زباں کوتاہیاں ہیں، اِس لئے مرگئے، اُس لئے مرگئے، یہ سب لاعلمی کے تیر ہیں، جو چلائے جا رہے ہیں ورنہ اللہ کے یہاں یہی ہے، بأجل مسمی، طے شدہ عمر لے کر آتے ہیں، جو بھی گیا، جس طرح گیا جن اسباب سے گیا، یہ اسباب صرف دکھاوے ہیں، یہ اسباب دکھاوے ہیں، یہ اصل سبب نہیں ہیں موت کے، یہ اصل سبب ہوتے تو صحت مند کیوں مرتا؟ ہر طرح کے لوگ دنیا سے جارہے ہیں، جس حالت میں اللہ نے جس کے لئے طے کردیا ہے، وما تدری نفس ماذا تکسب غدا کسی کو نہیں معلوم کہ کل وہ کیا کرے گا، وما تدری نفس بأی أرض تموت کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں مریگا، انسان اپنی مدت پوری کرکے جاتا ہے۔

ایک طرف تو اس کی روح کا یہ عالم ہوتا ہے جو اوپر سے ہی آئی تھی، یہ نیچے سے نہیں تھی، تمام جانداروں میں جو روح ہے، گائے میں بیل میں بھینس میں بکری میں وہ جان ہے، وہ جان نیچے سے پیدا ہوئی ہے وہ جان ہے، جو مختلف Elements کے جمع ہونے سے کیمیکل ترکیب کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے، اور جس کا اثر یوں بھی دیکھتے ہیں کہ زمین خشک ہے اور بارش ہوتی ہے تو کیڑے کچکچانے لگتے ہیں، اور کتنی زندگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، یہ زندگی جو ہے، ظاہر ہے کہ مختلف اسباب سے جو دنیا کے اسباب ہیں، مادی اسباب ہیں، جو Elements ہیں ان کے ذریعہ سے خاص طریقہ پر وجود میں لائی جاتی ہے، اس پر بھی انسان قادر نہیں، یہ ایک معجزہ ہے، ان Elements کو ملا کر کوئی آدمی بھی جان پیدا کردے، کوئی چیونٹی بنادے، کوئی مکھی بنادے، کسی کے بس کی نہیں۔ لیکن یہ جو انسانی روح ہے یہ عالم بالا سے آتی ہے، یہ اس سے الگ ہے، اس حیوانی روح سے الگ ہے، جو صرف انسان کو دی جاتی ہے، اسی لئے یہ فرق ہے کہ ہر جاندار زمین کی طرف دیکھتا ہے، اس کی خواہش صرف اس کی غذا ہے، شیر کو گوشت چاہیے، چیتے کو گوشت چاہیے، چرند کو چرنے والی چیز چاہیے اور پرندہ کو اپنی غذا چاہیے، بس، اس کے علاوہ کوئی فلاسفی، کوئی Thought، کوئی فن، یہ ان کے لئے ہے ہی نہیں۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ حیوان بھی ہے اور وہ ملکوتی صفات بھی اختیار کرتا ہے، وہ بادشاہ بھی بنتا ہے، وہ وزیر بھی بنتا ہے وہ ادنی بھی ہوتا ہے وہ اعلی بھی ہوتا ہے، اعلی سے اعلی علم کا کمال بھی دکھاتا ہے، عالم بالا کی پرواز کرنا چاہتا ہے، یہ سب اس لئے ہے

کہ ایک سیکرٹ، ایک ایسی اسپرٹ اس کے اندر ڈالی گئی ہے، جو اللہ کی طرف سے عالم بالا سے آئی ہے، وہ وہیں رخصت ہوتی ہے۔ جسم قبر میں ڈال دیا جاتا ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے: مومن بندہ قبر میں ڈالا جاتا ہے، جنت کی کھڑکیاں معنوی دنیا میں یعنی زمین پھاڑی نہیں جاتی، زمین کاٹی نہیں جاتی، اللہ میاں زمین کے پردوں کا محتاج نہیں ہے، آج تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ ہزاروں لاکھوں میل کی دوری پر ہیں، اور سیکنڈوں میں الیکٹرانکس میڈیا کے ذریعہ آپ باتیں کرتے ہیں، فوٹو دیکھتے ہیں دوسروں کے، نہ کمرے کی دیواریں حائل ہو رہی ہیں نہ دروازے حائل ہو رہے ہیں،، جو Webs چل رہی ہیں، ان میں جو ایٹھر ہیں، اور پھر وہ اتنی لطیف ہیں کہ صاحب! ساری کھڑکیاں بند، مکان بند، اور بالکل ٹائٹ ہے، اس کے باوجود بھی وہ جو الیکٹرانکس Webs ہیں وہ اپنا کام کر رہی ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے بھی لاکھوں کروڑوں درجہ زیادہ لطیف جنت کی Webs ہیں، دوسری طرف نعوذ باللہ جہنم کی۔ تو مردہ ایمان کے ساتھ جب رخصت ہوتا ہے، سچ پوچھئے تو سب سے بڑی دولت ایمان ہے، لا الہ الا اللہ پر جس کی موت ہو جائے، اللہ پر یقین، نبی پر یقین، آخرت پر یقین، قرآن پر یقین، یہ ایسی دولت بے بہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی پر بخشش فرما دیتا ہے، جو بندہ اس کے ساتھ رخصت ہو گیا تو وہ جنت کے گہوارہ میں چلا گیا، ابھی سے وہ جنت میں چلا جاتا ہے، معنوی دنیا میں، روحانی دنیا میں جو اس کی روح اعلیٰ علیین میں گئی ہے اس روح کے ذریعہ سے اس کے جسم کا رابطہ قائم رہتا ہے، اور یہ رابطہ ایسا ہے جیسے کسی بھی سوئچ کے ذریعہ ہزاروں میل دوری پر کرنٹ آپ منتقل کریں تو وہ کرنٹ کا رابطہ قائم رہتا ہے، اور وہ روح اس اعلیٰ علیین کے مقام پر جنت کا جو فیضان حاصل کرتی ہے وہ فیضان اس کے جسم کو قبر کے اندر اسی طرح محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنت میں ہے، باغیچوں میں، جنت کے پارکوں میں، چشموں میں، راحتوں میں ہے، جن کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، اس دنیا میں آدمی سوچ ہی نہیں سکتا ان نعمتوں کو، وہ نعمتیں ابھی سے دی جانے لگتی ہیں، عالم برزخ پورا عالم آخرت کا حصہ ہے، اس کا زینہ ہے، حضرت عثمانؓ کسی قبر پر جاتے تو بے ساختہ رونے لگتے، لوگ ان سے کہتے کہ آپ جو ہیں موت کے تذکرہ سے اور جنت و دوزخ کے تذکرہ سے اتنا نہیں روتے جتنا قبر پہ آکر روتے ہیں، تو فرمایا کہ بھئی یہ آخرت کی پہلی منزل ہے، یہ منزل اگر ٹھیک ہے تو بس پھر سب منزلیں ٹھیک ہیں، تو بڑا گریہ طاری ہو جاتا تھا حضرت عثمانؓ پر۔

سب سے بڑی نعمت یہ ہے، سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ آدمی دنیا سے رخصت ہو، اور جو ایمان کے ساتھ اور اچھے اعمال کے ساتھ، اور صدقہ جاریہ کے ساتھ، اچھی اولاد کے ساتھ، خیر و فلاح کے کام کے ساتھ رخصت ہوا اس کے بارے میں تو ظاہر ہے کہ نیک لوگوں کی زبانیں گواہی دے رہی ہیں کہ وہ صاحب حق تھا، صاحب ولایت تھا، اور اللہ کی طرف سے نوازشوں کا وہ مستحق ٹھہرایا گیا، اور اللہ کی کرم فرمائیوں کے گہوارہ میں، اور پھر ہم نے تو یہ سمجھا کہ ہم نے مٹی کے نیچے دبا دیا، ہم مٹی کے نیچے دب گئے وہ تو جنت کے باغوں میں چلا گیا، اس لئے کہ جسم اصل نہیں، سارا بناؤ سنگار لوگ جسم پر کرتے ہیں، ٹھیک ہے جسم دیا ہے اللہ نے تو اس کو ٹھیک رکھنا ہے، لیکن یہ ایک سواری ہے، یہ سواری ہے، جس دن روح کا کرنٹ جدا ہوگا اس جسم کو کوئی گھر پر رکھتا نہیں، یہ جسم اصل نہیں، ہر شخص کو چاہئے جو زندہ ہے انہیں چاہیے کہ موت کی حقیقت کو یاد رکھیں، اور زندگی اس طرح گذاریں کہ یہ لگے کہ صبح ہے تو پتہ نہیں شام ہوگی کہ نہیں، شام ہوئی تو پتہ نہیں کہ صبح ہوگی یا نہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے کاندھے پر حضور اکرم ﷺ نے ہاتھ رکھ کر ایک دن فرمایا: كن في الدين كانك غريب أو عابر

سبیل، دنیا میں اس طرح رہو جیسے اجنبی رہتا ہے، پردیسی رہتا ہے، دنیا کو وطن مت سمجھو، مسافر کی طرح رہو، اسی میں اصل لذت ہے، دنیا کو جو وطن سمجھتا ہے وہی پریشان ہوتا ہے، گھبراتا ہے، یہ چھن گیا، وہ لٹ گیا، وہ ہو گیا، ارے ظالم یہ تیرا وطن کہاں ہے؟ ریل پر کوئی شخص بیٹھے اور پھر فکر کرے کہ فرنیچر خرید لوں، فرج خرید لوں، ریل کے ڈبہ میں یہ لگالوں، وہ لگالوں تو لوگ اسے سنکی کہیں گے، پاگل ہو گیا ہے، ابھی تو ریل پہنچا دے گی اترنا پڑے گا، سواری کو سواری سمجھنا ہے اور مسافرت کو مسافرت سمجھنا ہے، تو یہ دنیا مسافرت کی جگہ ہے، یہ وطن نہیں ہے، اس لئے اس دنیا سے جی ایسا لگانا کہ دل اسے دے دیا جائے، عقلمندوں کا کام نہیں ہے، یہاں سے تو سب کو جانا ہے، ہر وقت تیار رہنا چاہیے جانے کے لئے، یہی فرمایا نبی پاک علیہ الصلوۃ والسلام نے: ایسے رہو جیسے پردیسی رہتا ہے، ایسے رہو جیسے مسافر رہتا ہے، اور اپنے بارے میں ارشاد فرمایا: انما أنا كعابر سبيل استظل تحت شجرة ثم راح و ترك ۔ میری مثال ایک مسافر کی ہے جو کسی درخت کے نیچے تھوڑی دیر سایہ لیتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے، یہ خود نبی پاکؐ کا اپنا حال ہے جو آپ بیان فرما رہے ہیں۔ جو سبق لینا ہے، زندوں کو جو سبق لینا ہے وہ یہ کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے پل پر چڑھ کر ہم لوگ آخرت کے مقام پر پہنچتے ہیں، اور بہر حال وطن وہاں ہے یہاں نہیں، یہ مسافر خانہ دیا گیا ہے آزمائش کے لئے، عمل کے لئے، جانچ کے لئے۔ خیر کی طرف بڑھتے ہو کہ شر کی طرف، ایمان لیتے ہو یا کفر، توحید پر چلتے ہو یا شرک پر، سنت کو اختیار کرتے ہو، یا بدعت کو، کونسا راستہ اختیار کرتے ہو، فیصلہ یہیں سے ہوگا، کہ وطن جہنم ہوگا یا جنت، ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار دے دیا ہے، موقع دے دیا ہے، سہولت دے دی ہے، انبیاء بھیجے ہیں، کتاب نازل کی ہے، ہدایت دے دی ہے، ہر وقت انتظامات فرمائے، ظاہر ہے کہ ان سے وہی شخص محروم ہوتا ہے، جس نے اپنی بدبختی خود چاہی، اس لئے ہم میں سے ہر فرد بشر کو زندگی سے زیادہ موت کو یاد رکھنا چاہیے، اور زندگی بھی موت کے لئے ہونا چاہیے، زندگی میں کام ایسا کرنا ہے کہ موت کی تیاری نظر آئے، ہر کام میں یہ لگے کہ یہ بندہ موت کی تیاری میں لگا ہوا ہے، ہر کام، نماز پڑھ رہے ہیں تو ایسا لگے کہ شاید آخری نماز ہو، روزہ رکھ رہے ہیں تو شاید آخری روزہ ہو، قرآن پڑھ رہے ہیں تو شاید آخری تلاوت ہو، اس شخص کا حال کیا ہوگا جس کو بتا دیا جائے کہ کل صبح تمہیں پھانسی دے دی جائے گی، اور اس کے بعد اب وہ عبادت کرے، دعا کرے، وہ سمجھ رہا ہے کہ آخری، بس آخری مرحلے ہیں، جتنا بھی اللہ سے مانگنا ہے مانگ لے، یہ کیفیت اس کی تو ہے ہی جس کو بتا دیا گیا، ہمیں بتایا نہیں گیا وقت، لیکن یہ بتا دیا گیا کہ بہر حال رخصت ہونا ہے، تو جب یہ ہے تو اب وقت کی تلاش میں نہیں رہنا ہے، کہ وہ کسی کو نہیں معلوم کہ کب آئے گا، نبی کو بھی نہیں بتایا گیا، کہ آپ کو کس دن کس وقت رخصت ہونا ہے۔ اس لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیے، موت کے لئے۔ زندگی گذارنی چاہیے اس لئے کہ صحیح سلامت وطن میں پہنچ جائیں۔

جو چلے گئے ان کے لئے دعا کر کے جایئے، ان کے اچھے کاموں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، ان کے کاموں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، ان کے کاموں کو باقی رکھنا چاہیے، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے اور جو موجود ہیں ان کے اندر فکر پیدا کرنی چاہیے، تیار کرنا چاہیے کہ بھائی مسافر خانہ سے جب بھی نکلیں اس طرح نکلیں کہ ہمارا کچھ بھی نہ چوری ہوا ہو، نہ ڈکیتی، پڑی ہو، نہ کسی طرح کی غفلت نے ہمیں نقصان پہنچایا ہو، اللہ تعالیٰ اپنا رحم فرمائے۔

☆☆☆

مولانا سید بلال حسنی صاحب کا تعزیتی خطاب

تلخیص: ابوطلحہ ندوی
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

محترم ڈاکٹر غیاث صدیقیؒ کی تعزیت کے لئے علامہ ابو الحسن علی حسنی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، علی گڑھ کے صدر محترم مولانا بلال حسنی ندوی صاحب (صدر پیام انسانیت فورم) علی گڑھ تشریف لائے، ڈاکٹر صاحبؒ مرحوم کے اھل خانہ ومتعلقین سے تعزیت فرمائی، بعد ازاں مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کی مسجد میں ۱۲/بجے مولانا کی تعزیتی تقریر ہوئی، اسی تقریر کی تلخیص مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے استاذ مولانا ابو طلحہ ندوی صاحب کے قلم سے پیش خدمت ہے۔(ادارہ)

بعد حمد وصلاۃ کے فرمایا:

ہر وہ کام جس میں توازن ہو، اور صحیح فکر کے ساتھ انجام دیا جائے، جس میں درد اور تڑپ ہو اور اخلاص واخلاق کی دولت سے آراستہ ہو وہ کام برگ وبار لاتا ہے، ہمارے ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں دین کی صحیح تڑپ، اخلاص اور توازن کے ساتھ دین کی خدمت انجام دینے کی فکر موجزن تھی، یہ وہ صفات تھیں جس کو ہر ایک ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور ہے اور یہ ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہے، اپنی زندگی میں اتارنے کی ضرورت ہے، ان کی فکر کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب مرحوم اخلاق میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور اخلاق رسول اللہ کی سیرت کا سب سے اہم حصہ ہے، جو جتنا اللہ کے رسول سے قریب ہوگا، سیرت نبوی سے مانوس ہوگا، وہ اسی قدر عند اللہ محبوب ہوگا، اور یاد رکھئے کہ سیرت صرف چند واقعات کا نام نہیں ہے، سیرت پوری زندگی ہے، مکمل نظام حیات ہے، انفرادی و اجتماعی دعوتی طریقۂ کار ہے، دین کی گہرائیاں ہیں جو جتنا سیرت سے قریب ہوگا، اللہ اس کی اتنی مدد کرے گا، إن الله لا يضيع أجر المحسنين اللہ ان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا جو احسان کی صفت سے آراستہ ہوتے ہیں، اور احسان کی تعریف ہے کہ ہر کام اس طرح کرو گویا اللہ تم کو دیکھ رہا ہے، اخلاص سے کام میں روح اور نورانی کیفیت پیدا ہوتی ہے، انسان جس مقصد کے تحت کام کرتا ہے اس کو اس کا وہی مقصود حاصل ہوتا ہے، لہذا ہر کام اخلاص کے ساتھ کیا جائے کیوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جو ضائع نہیں ہوتا۔

مفکر اسلام جناب مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے ایک حقیقت پسندانہ مختصر سا جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ "مخلص کا سفینہ ڈوبتے ڈوبتے بھی پار لگ جاتا ہے اور غیر مخلص کا سفینہ پار لگتے لگتے بھی ڈوب جاتا ہے" کوئی بھی کام ابتداء میں کتنا ہی معمولی دکھتا ہو، اخلاص کی دولت اس میں جان ڈال دیتی ہے، اور کام

کرنے والا انسان کتنی بھی معمولی صلاحیت کا مالک ہو اگر اس کے اندر اخلاص اور درد ہے تو اللہ نہ صرف اس کام کو محبوب رکھتا ہے بلکہ اس کو مقبول و مشہور بھی فرماتا ہے، آپ حضرت مولانا الیاسؒ کی مثال لے سکتے ہیں جو نہ بڑے مصنف تھے اور نہ مقرر، مگر ان کے اندر اخلاص اور امت کا جو درد تھا اس کے ثمرہ میں اللہ نے ان کے کام کو کتنا مقبول فرمایا کہ آج لاکھوں نہیں کروڑوں اس کے ذریعہ اپنی آخرت سنوار رہے اور راہ یاب ہو رہے ہیں۔

ہر کام کے لئے وسائل بھی ضروری ہیں، وسائل کا بھی استعمال کریں لیکن وسائل کے استعمال کا جو مقصود ہے اس پر توجہ دیں، دیوبند و ندوہ نے اپنے ابتدائی دور میں وسائل کی عدم فراوانی کے باوجود کیسے کیسے لوگ پیدا کیے، آج اپنے اندر وہی شوق و تڑپ اور امت کی فکر بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

موت تو سب کو آنی ہے اور موت سے لوگ ڈرتے ہیں جبکہ سچے ایمان والے کے لئے تو موت رحمت ہے، جن کی زندگی صحیح اسلامی طریقہ پر گذری ہو، ان کے لئے موت راحت کا سامان ہے، کوئی کسان مہینوں انتھک محنت کرے، اور جب اس کے کاٹنے کا وقت آئے اور وہ پک جائے تو رونے اور چلانے لگے، اور اسے کاٹنے سے انکار کرے تو اسکو بیوقوف گردانا جائے گا، کیوں کہ فصل کا مقصود ہی اس کو کاٹنا اور اس سے نفع اٹھانا ہے، اسی طرح زندگی صحیح اسلامی طریقہ پر گذار کر دنیا سے رخصت ہو جانا ہی تو مقصود ہے تا کہ بعد کی زندگی کا نفع اٹھایا جا سکے، اور آخرت کی ابدی زندگی تک پہنچنے کے لئے موت ضروری ہے۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی نمونہ ہے ہم سب کے لئے، اور ہمیں امید ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنی زندگی صحیح فکر کے ساتھ، دین اور امت کی تڑپ میں گذاری، یہ ان کے لئے ذریعہ مغفرت اور راحت کا سامان ہوگی۔ ڈاکٹر غیاث صاحب کے اندر تین صفات بہت نمایاں تھیں، اخلاص، امت کا درد اور اخلاق۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات واقعی ایک سانحہ ہے، ہم سب کے لئے، اور حسنی خاندان نے ان کی وفات کو اس طرح محسوس کیا جیسے خود ان کا کوئی عزیز رخصت ہو گیا ہو، ڈاکٹر صاحبؒ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور حسنی خاندان سے کتنی والہانہ محبت کرتے تھے، یہ ہر کوئی جانتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ افراد جن کو حضرت مولاناؒ سے مخلصانہ اور والہانہ لگاؤ تھا تو گنتی کے چند لوگوں میں ڈاکٹر صاحبؒ کا نام ضرور لیا جائے گا، علی گڑھ آتے وقت جناب حضرت مولانا رابع حسنی صاحب نے خود فرمایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی وفات کا بڑا گہرا اثر ہوا ہے قلب پر۔

یہاں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی صلبی اور روحانی دونوں اولادیں موجود ہیں، جن کو ڈاکٹر صاحب کی فکر، ان کی محنت اور ان کے کام کو اسی توازن اور اخلاص کے ساتھ آگے بڑھانا ہے، بالخصوص اس مدرسہ کے طلبہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جس پودے کو ڈاکٹر صاحب نے خون جگر سے سینچا ہے اس کو پروان چڑھائیں اور ان کے خواب کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

میں طلبہ سے کہتا ہوں، کہ اصل تو آپ لوگ ہیں، مدرسہ کوئی عمارت کا نام نہیں، یہ تو وسائل ہیں، مدرسہ کی روح تو طلبہ ہوتے ہیں، اگر مدرسہ کے طلبہ بیدار ہو جائیں اور ان میں صحیح فکر اور دینی تڑپ پیدا ہو جائے تو گویا مدرسہ زندہ ہے، اور اس میں زندگی کی رمق موجود ہے، لیکن اگر طلبہ ہی اس درد اور اخلاص سے خالی ہوں تو پھر یہ مدرسہ کی موت ہے، چنانچہ آپ کو چاہیے کہ اپنے اندر اخلاص اور درد پیدا کریں اور ڈاکٹر صاحبؒ کے کام کو آگے بڑھائیں، یہی ان کی محنت کا صحیح صلہ ہوگا۔ اللہ تعالی ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے اور ان کے اس کام میں برکت و مقبولیت عطا فرمائے۔

☆☆☆

شمع روشن بجھ گئی، بزم غیاث ماتم میں ہے۔

عمیر الصدیق ندوی دریاآبادی

شام تھی کہ علی گڑھ سے برادر معظم جناب جمال فاروقی فون پر ٹوٹے بکھرے لفظوں میں صرف اتنا بتا سکے کہ ڈاکٹر غیاث صاحب رخصت ہوگئے، چند لمحوں بعد وہ فون آیا جہاں لفظوں کو اپنی شکستگی کا بھی گلہ نہیں تھا، نہ حرف تھے نہ صوت نہ صدا، بس سسکیاں تھیں یا ہچکیاں تھیں جو بتا رہی تھیں کہ ہے اس کی جدائی میں بہت اشک افشانی۔ ڈاکٹر غیاث اپنے رب رحیم کے حضور پہنچ گئے، یقیناً ہم سب کو بھی اس کے پاس جانا ہی ہے، لیکن فرقت کے ماروں کی اس سچائی کا کیا کیا جائے جس کا دوسرا نام حزن ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کی لو تو کچھ عرصہ سے مدھم ہو چلی تھی لیکن کیا ہوا، کچھ تو روشنی کا احساس تھا، اب یہ احساس اس حقیقت میں بدل گیا کہ شمع روشن بجھ گئی، بزم غیاث ماتم میں ہے، اب کیا اور کیسے کہا جائے کہ یہ ماتم ایک زندگی کا ہے یا اس کا جو کئی زندگیوں کا نمائندہ تھا، ان کو ذرا قریب سے دیکھنے کا وقت تب ملا جب ان کی زندگی کی شام تھی، لیکن اس کی سرخ روئی وہ سب بیان کر رہی تھی جس کے سبب یہ شفق اتنی دلکش اور اتنی جاذب بنی تھی۔

یوں دیکھیے تو وہ ندوہ کے عالم تھے، نہ مصنف، نہ خطیب، نہ قائد، نہ رہبر، ڈاکٹر تھے لیکن نہ بڑے چیمبر، نہ بینر، لیکن پھر بھی بڑے سے بڑے عالم بلکہ علماء کے منظور نظر اور مشہور سے مشہور طبیبوں اور معالجوں سے زیادہ مریضوں کے لیے صاحب ہنر۔ عموماً ایسی دولت ملتی نہیں لیکن جن کو ملتی ہے، اس کی کچھ تو وجہیں ہوتی ہی ہیں۔ چند ملاقاتوں میں دل میں اتر جانے کے ہنر کے راز خود بخود عیاں ہونے لگے اور بیاں کرنے لگے کہ مقاصد کی کامیابی، یقین اور یقین کے مطابق عمل میں ہے، اور عمل بھی محض عمل نہیں بلکہ ایک مسلسل جدوجہد، لگاتار محنت جس کا سر رشتہ اصل مقصد یا منزل سے کبھی کمزور نہ ہو، اس راہ میں ہر دشواری، ہر رکاوٹ اور ہر مصیبت کو تحمل اور بردباری بلکہ خندہ پیشانی سے قبول کرنا اور ہمیشہ اس کے لئے تیار رہنا ہی زندگی کا واحد اصول ہو، یہ گُر ڈاکٹر صاحب کی بظاہر خاموش زندگی کے اندرون کو بے قراری عطا کرتے رہے، ان کی مسیحا نفسی کی باتیں آتیں، ان کے مطب پر صحت و شفا کی آس لگانے والوں کی بھیڑ دیکھی جاتی اور یہ علی گڑھ اور خصوصاً یونی ورسٹی کے شہر علم و حکمت میں جہاں علم و حکمت والوں کی کثرت آنکھ کو خیرہ کر دیتی ہے، وہاں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مرجعیت اور مقبولیت، رشک کے لائق خود بخود بن جاتی ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ ان کی فکر اور عمل کا جو پہلو سب سے تابدار اور آبدار نظر آیا وہ ان کا یہ احساس تھا کہ سلبی اور منفی باتیں کبھی اصل منزل کی یافت میں جوش و خروش نہیں پیدا کر

سکتیں، کوئی بھی عمل تب ہی عمل صالح کہلانے کا حق رکھے گا جب نیت صالح ہوگی، نتائج صرف اسی سچائی سے مثبت اور نافع نکلتے ہیں شاید، بلکہ غالباً، ایسے ہی احساسات تھے جنہوں نے ان کو عصری تعلیمات کے شہر میں ابدی تعلیمات کی تلاش پر آمادہ کیا، مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے باقیات میں بجز چند یادوں کے ان کو جب کچھ نہ ملا تو انہوں نے وہ کیا جس کی حسرت تو شاید بہتوں کو رہی ہوگی لیکن جس کی توقع کم ہی نے کی ہوگی، خردگاہوں کی حکیمانہ نظروں کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن عشق کی عطا کردہ حدیث رندانہ کا کیا مقابلہ۔ ڈاکٹر صاحب اسی مے خانہ کو علی گڑھ میں آباد کرنا چاہتے تھے جہاں صراحی اور دور کے بغیر بھی بزم جاناں رنگیں رہے اور یہ رنگینی فقط نگاہ سے پیدا ہونے والی ہو۔ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے سنگ بنیاد رکھے جانے کے وقت، دعاؤں اور آنسوؤں سے بھیگی فضا میں کسی نے سرگوشی ضرور کی ہوگی کہ یونیورسٹی کے پہلو میں دیوبند وندوہ کی اس دھڑکن کا مقصد کیا ہے، اس سرگوشی کا جواب بھی شاید یہی دیا گیا کہ

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے

دیکھتے دیکھتے مدرسۃ العلوم الاسلامیہ ایک شاندار حقیقت میں بدلا، اجڑے ہوئے شہر کی آبادی کا یہ منظر معمولی نہیں اور جب سال دوسال پہلے مدرسہ کے دامن میں عرب وعجم کے اہل دل اور اہل نظر سرمایہ ملت کے ایک نگہبان حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے فکر وعمل سے اکتساب نور کے لیے جمع ہوئے تو دیکھنے والے خدا جانے کیا کیا دیکھ رہے تھے، لیکن ایک گوشہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم شعر مجسم بنے ہوئے تھے کہ ؎

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

ڈاکٹر صاحب کی متانت، رزانت، خاموشی، سوز، اخلاص، مروت، فیاضی، فروتنی، خدمت گزاری اور خود کو مٹا رکھنے کی خوشی کی باتیں ہوتی رہیں گی، ان کی نگاہ انتخاب کی داد دی جاتی رہے گی، ان کی خوبیاں ان کی یادوں کی زندگی بڑھاتی جائیں گی، ابھی تو صرف یہی کہنے کو دل چاہتا ہے کہ

شمع روشن بجھ گئی، بزم غیاث ماتم میں ہے۔

☆☆☆

نوٹ

محترم قارئین کرام! ادارہ کے بانی ورسالہ کے نگراں محترم ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت ہم سب کے لئے بڑی تکلیف دہ ہے، ابھی اس کے غم سے قلب وذہن نڈھال ہی تھے کہ رسالہ کی اشاعت کا وقت آپہنچا، اس وجہ سے مرحوم پر کوئی ''خاص نمبر'' تو ہم پیش نہ کر پائے، عجلت میں جو بھی بن پایا وہ پیش خدمت ہے۔ البتہ پھر بھی دو کے سوا سارے مضامین مرحوم پر ہی ہیں، جو اگرچہ سب تاثراتی ہیں، لیکن یہ بھی مرحوم کے محبین ومتعلقین کے لئے خاص کشش کا باعث ہوں گے۔

ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی

جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

اشہد جمال ندوی

آج ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی صاحب کی قبر میں مٹی ڈالتے وقت آنسو پر قابو نہ پاسکا، وفات حسرت آیات کی خبر ہی اندوہناک تھی۔ جنازے میں جگر تھام کر کھڑے رہنا، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی کی رندھی ہوئی آواز میں تکبیرات کا ساتھ دینا اور پھر کندھے پر رکھ کر قبر تک لے جانا بھی مشکل امر تھا، لیکن قبر میں رکھے جانے کے بعد بار بار احساس ہو رہا تھا کہ بہت ہی قیمتی سرمایہ سپرد خاک کیا جا رہا ہے۔

نماز جنازہ کا بھی کیا منظر تھا! قطار اندر قطار ہزاروں لوگ کھڑے، ساکت وغمزدہ، ممنون کرم، کوئی لب کو جنبش دیتا تو خوبیاں ہی گناتا، محبت، مروت، اخوت، خوش خلقی، ہمدردی، ایثار کون سی خوبی تھی جو ان کے اندر بدرجہ اتم موجود نہ تھی۔ قوم کی خدمت کا جذبہ قدرت نے ایسا ودیعت کیا تھا کہ ہر دم قوم وملت پر نثار۔ وہ باتیں پرانی ہوئیں جب علی گڑھ میں آئے دن فساد بپا رہتا تھا۔ فسادات کے ایام میں ڈاکٹر غیاث کی مسیحائی زباں زد خاص وعام تھی۔ ہر دکھی کے درد مند، ہر غم زدہ کے غم میں شریک۔ نامعلوم کتنی بہنوں کی عزت بچائی، کتنے لوگوں کو پناہ دی اور کتنے لوگوں کی کفالت کرتے رہے اور یہ سب کچھ صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز صرف اس جذبہ کے ساتھ ؎

میری ہستی شوق پیہم، میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر، گذرا چلا جاتا ہوں میں

ملت کی تعلیمی پسماندگی کا رونا بہت رویا جاتا ہے۔ سرسید بھی بہت روئے تھے، مگر رو پیٹ کر صبر نہیں کر لیا بلکہ اس کے خلاف تحریک برپا کی اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کر کے اس کے مداوا کا سامان کیا، ڈاکٹر غیاث بھی سچے علیگ تھے۔ انہوں نے سید والا گھر کے اس مشن کو آگے بڑھایا اور اسے نئی جہات دیں۔ آج وہ منظر یاد آرہا ہے جب ڈاکٹر صاحب نے ایک چھوٹے سے پلاٹ پر نئی درسگاہ کے قیام کا اعلان کیا تھا، اس وقت آواز مدھم تھی مگر عزائم بہت بلند تھے۔ اور اب ان بلند عزائم کا مظہر اس جگہ پر ایک عظیم الشان ادارہ ہے جو علی گڑھ میں ندوہ کا منظر پیش کر رہا ہے اور اپنے جلو میں کئی اداروں کو سموئے ہوئے ہے۔ پچھلے دس پندرہ برسوں میں جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی، اسی کے ارتقاء واستحکام کی فکر میں ڈوبا ہوا پایا ؎

بدلنے کو ہزاروں کروٹیں بدلیں زمانے نے
مگر میری جبیں بدلی، نہ اس کا آشیاں بدلا

آج جی کسی کا نہیں چاہ رہا تھا مگر رب ذوالجلال کا حکم یہی تھا۔ سب منوں مٹی کے نیچے انہیں دفن کر کے واپس ہو گئے، اس وقت ان کا پرنور چہرہ اور پرکشش شخصیت آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ بولتے تو منہ سے پھول ٹپکتا، چلتے تو وقار جھلکتا، طلبہ سے مخاطب ہوتے تو لہجہ سوز سے بھرا ہوتا۔ قائدین ملت سے روبرو ہوتے تو ایسی فدویت وانکساری کہ قائد بھی شرمندہ ہو جائے۔ ان کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو فکری صلابت اور ہر طرح کی عصبیت سے پاک ہونا تھا۔ آج جب کہ ہر آدمی گروہی، جماعتی اور مسلکی عصبیت میں گھرا ہوا ہے، ان عصبیتوں سے بچا لے جانا بہت مشکل کام ہے، اللہ نے یہ ملکہ بھی انہیں عطا کیا تھا۔ اللہ نے انہیں خوب خوب نوازا تھا۔ دولت عطا کی اور دولت کے استعمال کا سلیقہ بھی عطا کیا۔ اس کی شہادت ان مریضوں، پڑوسیوں اور محتاجوں کی اشک بار آنکھیں ہیں جو ان کے رخصت ہونے کے بعد خشک ہونے کا نام نہیں لے رہی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جو بھی سرپرستی میں آیا، ان کے جود وکرم سے ضرور فیضیاب ہوا۔ اللہ کے انعامات میں ایک بہت بڑا انعام ذریت کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنانا ہے۔ انبیاء کرام اس کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ اللہ نے ڈاکٹر صاحب کی ذریت کو ایسی صالحیت، سلیقہ مندی اور شکر گزاری کا ملکہ عطا فرمایا ہے کہ لوگ دیکھ کر رشک کریں اور اپنے لیے ایسے ہی فضل وکرم کی دعا کریں۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

مرحوم ڈاکٹر غیاث صاحب اب دنیا میں نہیں رہے، مگر جو ورثہ اور نقوشِ راہ چھوڑ گئے ہیں، وہ بہت قیمتی اور قابل تقلید ہیں۔ آرزو ہے اور دعا بھی کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، ان کے آثار کو قائم ودائم رکھے، ان کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ویسے ہی مخلص، بے لوث، وسیع النظر اور وسیع المشرب جانشین عطا فرمائے۔

☆☆☆

مولانا ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی علیہ الرحمہ

یادیں اور نقوش

محمود حسن حسنی ندوی
نائب مدیر: تعمیر حیات، ندوۃ العلماء لکھنو

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، امابعد!

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے دو تین سال قبل کی بات ہے کہ آل انڈیا دینی تعلیمی کونسل نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے احاطہ میں اپنی ایک کانفرنس کا انعقاد کیا تھا جس کی صدارت صدر دینی تعلیمی کونسل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی فرمائی تھی، اوران کا قیام اپنے قدیم میزبان ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ صاحب علیہ الرحمہ کے مکان پر تھا جو انہیں یونیورسٹی کی طرف سے ملا ہوا تھا، وہاں ایک شخصیت کو بہت متحرک وفعال دیکھا جو حضرت مولانا کی شیدائی اور فدائی ہونے کے ساتھ ساتھ اس فکر میں تھی کہ کس طرح لوگ زیادہ سے زیادہ حضرت مولانا سے مستفید ہوں، دیکھا کہ وہ ایک گروپ کو ملانے کے لئے لائے، اور حضرت سے انہیں کچھ نصیحتیں کہلوائیں، اور لوگ بیعت بھی ہوئے، معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ میڈیکل کالج کے طلبہ ہیں، اور ملانے والے مخدومی ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی صاحب ہیں، جن کا یہاں اچھا اثر ورسوخ ہے اور طلبہ کی یونین پر بھی اثر رکھتے ہیں، اور بہت مقبول اس طور پر رہے ہیں کہ اپنی سماجی، رفاہی، سیاسی خدمات سے لوگوں کے دلوں کو جیت چکے ہیں، جب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ٹرین سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئے اور پیچھے ہم میں سے بعض لوگ رہ گئے جن کو دوسری ٹرینوں سے جانا تھا، انہی میں خال محترم مولانا سید اسحاق حسینی ندوی (برادر عزیز حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی) بھی تھے، ڈاکٹر غیاث صاحب کو جیسے معلوم ہوا کہ ان کا تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے گھرانہ سے ہے اوران کے برادر بزرگ حضرت ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ نواسے ہیں، تو انہیں اوراس راقم کو بھی اس خاندانی نسبت سے اظہار تعلق ومحبت میں اپنے گھر لائے، اور ناشتہ وغیرہ کا اہتمام کیا، خال محترم مولانا سید اسحاق حسینی ندوی پر ان کے محبانہ وپُرخلوص تعلق کا بڑا اثر پڑا اور اپنے اس تاثر کا ہم سے بھی اظہار کیا، ڈاکٹر صاحب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو رخصت کرتے وقت آبدیدہ تھے اور جذبات کو قابو میں رکھنا آسان نہیں لگ رہا تھا اور حضرت کو راحت پہنچانے کے لئے اپنے طور پر ایک گاڑی کرایہ پر لے لی تھی جو بعد میں ہم لوگوں کے کام آئی، بات آئی گئی ہوگئی، اور لوگ اپنے اپنے مقامات پر جا کر کاموں میں مشغول ہوگئے۔

جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تو علی گڑھ کے بارہ بنکوی نژاد یہ بزرگ بھی رائے بریلی پہنچے ہوئے تھے مگر دیدار حیات کا اب سوال باقی نہیں رہا، ان کے ساتھ ان کے فرزند اکبر ڈاکٹر محمد سعد صاحب اور دوست حاجی انوار احمد صاحب اور برادرم انجم فراز صاحب

تھے،لوگوں کے ہجوم سے حیران ہوکر بعض سے استفسار احوال کیا تو اس خبر سے بے قرار ہوگئے کہ حضرت مولانا اپنے مالک حقیقی سے جاملے، جنازہ کی تیاری ہے، ان کے حصہ میں جنازہ میں شرکت کی سعادت وشرف تھا جوان کی سچی محبت وتعلق سے اس طرح حاصل ہوا جو دوسری صورت میں اتنا آسان نہ تھا۔

چند مہینوں کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کا ساؤتھ افریقہ کا ایک سفر ہوا، جو ایک کامیاب دعوتی سفر تھا جس کی روداد ان کے قلم سے غیر مطبوعہ موجود ہے اور جس کا بڑا حصہ راقم کی تصنیف سیرت داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی میں آچکا ہے، وہ سفر سے واپسی پر ایسے علیل ہوگئے جیسے ان کو کسی کی نظر لگ گئی، حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ العالی نے ان کو علاج کے لئے اپنے پاس ہفتہ دو ہفتہ کے لئے علی گڑھ میں ٹھہرالیا، جس سے ان کو بہت راحت ملی اور فائدہ ہوا، آخری ایک دو روز راقم کو بھی ساتھ رہنے کا موقع ملا، اور پھر ساتھ لکھنؤ واپسی ہوئی، اس دوران ڈاکٹر محمد غیاث صاحب کی محبت وتعلق کے وہ نرالے انداز دیکھے جس میں وہ فدائیت اور شیدائیت تھی جوان سے پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ دیکھنے کو ملی تھی۔

ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کیا نہ کرڈالیں اور کیسا اعلیٰ سے اعلیٰ علاج جس کی سہولتیں اور وسائل انہیں حاصل تھے اس سے فائدہ نہ پہنچاڈالیں، مگر چوں کہ حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہم کی نگرانی میں علاج جاری تھا اس لئے اس میں مداخلت کی گنجائش نہ تھی، البتہ آرام پہنچانے کی جو شکلیں اور صورتیں ممکن تھیں ان کو اختیار کرکے وہ راحت پہنچاتے، جس کی ان کے تعلق کی بنا پر ان کے میزبان اور معالج حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہم بھی بڑی قدر فرماتے، یہ برادرانہ ونیازمندانہ تعلق حضرت ڈاکٹر صاحب نے جو اختیار کیا اس میں پھر آخر تک کمزوری نہ آنے دی، اور وہ بڑھتا ہی رہا، اور پھر حضرت ڈاکٹر صاحب نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے جانشین اور ان کے ہم صورت وہم سیرت بھانجے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم سے بیعت واسترشاد کا تعلق قائم کرلیا، اور حضرت کو اپنے یہاں دعوت دے کر اور علی گڑھ میں ایک کامیابی تعلیمی پروگرام منعقد کرکے اس تعلق کی تجدید کی جو انہیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تھا، پھر تو یہ تعلق اتنا بڑھ گیا تھا کہ ان کے انشراح کے بغیر کوئی بھی قدم اٹھانا ان کے لئے سخت گراں بار ہوتا، ان سے مشورے اپنے تعلیمی، دعوتی واصلاحی سبھی کاموں میں کرتے اور جب انھیں اپنی سخت جان لیوا بیماری کا انکشاف ہوا اور ان کے معالج صاحبزادہ ڈاکٹر محمد سعد اور دوسرے ماہرین طب وجراحت کے مشورے سے آپریشن ناگزیر سمجھا گیا تو اس کے مشورے کے لئے بذات خود وہ لکھنؤ تشریف لائے اور دوسری بار پھر آپریشن پر آپریشن ناگزیر سمجھا گیا تو بھی وہ سفر کی حالت میں نہ ہونے کے باوجود لکھنؤ تشریف لائے اور اجازت ودعا کے بعد انھوں نے اس کے لئے دہلی سفر کیا، اور پھر جب انہیں اندازہ ہوا کہ اب شاید زندگی کے ایام کم ہی رہ گئے ہیں، اور سفر کی طاقت بھی جواب دے رہی ہے تو آخری بار بڑی ہمت کرکے رمضان المبارک کا معمول برقرار رکھنے اور حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کا شوق پورا کرنے کے لئے پھر زحمت سفر اٹھائی اور ایک شب ودن کا حصہ تکیہ رائے بریلی میں گزارا، حضرت مولانا اعتکاف میں تھے ان سے وہاں دعا لی، اور پھر علی گڑھ واپس ہوئے، اس سفر میں بھی ان کے عزیز از جان صاحبزادے ڈاکٹر محمد سعد صاحب ساتھ تھے۔

ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے اس درجہ تعلق تھا کہ ان کی ذات، فکر ودعوت یا اسلوب پر اگر کسی نے بے جا تنقید کی تو پھر انھوں نے بھی اس کی علمی اسلوب میں اچھی خبر لی،

اوران کے مراسلے بھی شائع ہوئے۔ حضرت مولانا کی فکر کو عام کرنے کے جذبہ نے ان کے نام سے فاؤنڈیشن کے قیام اور مدرسہ وفاؤنڈیشن کے ترجمان کے طور پر ندائے اعتدال کا اجرا کرادیا، وہ فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری (ناظم) تھے اوراس کا صدر حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کو بنایا تھا اوران کی وفات کے بعد یہ منصب ان کے بھائی وجانشین مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کو دیا۔

جہاں تک مدرسہ کا تعلق ہے اس کی بھی ایک کہانی ہے جو ایک طرف دین کے لئے ان کے دردوسوز اورارتداد کے مقابلہ کی ایک کوشش اوردوسری طرف مفکراسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے ان کے تعلق کو بیان کرتی ہے، برادرم انجم فراز علی گڑھی نے علی گڑھ کے لوگوں میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے خاص اور جذباتی تعلق رکھنے والوں میں ایک نام محترمی جناب ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی کا بتایا تھا، علی گڑھ کے تعلق سے یہ اطلاعات ملتی رہی تھیں کہ وہاں مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کا اجتماع ہوتا جارہا ہے، جن میں لادینی عناصر بھی ہیں، اوروہ عناصر ہیں جوصرف روزی، روٹی اور مادی ترقی کی فکر رکھتے ہیں، جب کہ دینی تحریکات، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی کا اپنا کام بھی ہے، اوردوسری طرف شیعیت وبریلویت کے مراکز وہاں قائم ہیں، یہ اوراپنا کام کررہے ہیں جس سے اہل حق کے اذہان مسموم ہوتے نظر آتے ہیں، ان حالات میں وہاں ایک ایسے دینی مدرسہ کے قیام کی شدید ضرورت ہے جوندوہ کے خلا کو وہاں پُر کرسکے، اورصرف تعلیم کا نہیں فکری رہنمائی کا کام بھی کرے، اس کے لئے ایک سفر برادرم انجم فراز کی تحریک پر مولانا سید بلال حسنی ندوی صاحب کا علی گڑھ کا ہوا جس میں ان کے رفیق سفر کے طور پر راقم السطور نے بھی شرکت کی، اور باہم مشوروں سے ایک خصوصی نشست نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی نسبت سے ان کی قیام گاہ پر جواب ان کے حفید مکرم نواب ریاض الرحمٰن خاں شیروانی کی قیام گاہ ہے انہی کی صدارت میں ہوئی اورایک ایسے مدرسہ کے قیام کی بات رکھی گئی جوصرف تعلیم گاہ نہ ہو، فکری رہنمائی کا کام بھی کرے، اورایسے جامع افراد تیار کرے جوخالص دینی مدرسہ کی خصوصیات کے حامل اورعصری دانشگاہوں کی ضروریات کے واقف کار بھی ہوں، شیروانی خاندان کے متعدد اصحاب فکر وہاں مختصر دعوت پر جمع ہوگئے تھے، لیکن یہ آواز وہاں صدابصحرا ہوگئی تھی، اس کی وجوہات واسباب کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، البتہ اس کے فوراً بعد ایک نشست ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی صاحب نے اپنے مکان واقع جمال پور میں رکھنے کی اجازت دی، اورخود وہ اس کے داعی بن گئے اوراصحاب نشست کی فرمائش پر انہوں نے یہ ذمہ داری بھی قبول کرلی کہ وہ ایسے ادارہ کی ذمہ داری نبھانے کو تیار ہیں، رات کا وقت تھا انہوں نے اپنے رب کے حضور میں سجدہ ریز ہوکر خشوع وخضوع سے مدد چاہی "ایاك نعبد وایاك نستعین"۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اوران کو قبول فرمایا، وہ ناظم مقرر ہوئے، اورپھراسی سفر میں دوسرے موقع پر مولانا سید بلال حسنی ندوی نے مدرسہ کے نام کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قدیم نام مدرسۃ العلوم کی مناسبت سے اسلامی نسبت کے اضافہ کے ساتھ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ تجویز کیا، ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھی اسی کو پسند کیا، اورپھر وہ اس کی ترقی واستحکام میں پوری طرح لگ گئے، مہتمم مدرسہ کے آتے جاتے رہے، اول روز مولانا محمد ایوب بھوپالی کو یہ ذمہ داری دی، پھر مولوی انعام اللہ اعظمی آئے، اورپھر ڈاکٹر محمد طارق ایوبی نے ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیا، اوراس کو متعارف کرانے میں حصہ لیا، اورتعلیمی مراحل میں بھی اس نے ترقی کی یہاں تک کہ یہ ادارہ اس مقام کو اپنے ۱۳-۱۴ سال کے عرصہ میں پہنچ گیا کہ اس کے فارغین

عالمیت کی تکمیل کے لئے صرف ایک سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں گزارتے ہیں، اسکول وکالج کے طلبہ خصوصی درجات کے راستہ سے اور مدرسی تعلیم وحفظ کے طلبہ اپنے نظام سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور مختلف جماعتیں یہاں سے نکل کر دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل کرکے دین ودعوت کی تعلیم وتبلیغ اور تفہیم کے کام میں مصروف عمل ہیں، اور متعدد طلبہ نے درس نظامی کے مدارس میں دورۂ حدیث میں داخلہ لے کر عالمیت کی سند حاصل کی جہاں ان کا آسانی سے داخلہ ہوگیا تھا، یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے لئے بہترین صدقۂ جاریہ ہے کہ یہاں کے فرزندان وابناء ان کے فرزندان معنوی ہیں اور جانے والے کے جانے کے بعد اس کے کام آنے والے جن تین اعمال کا ذکر حدیث پاک میں آتا ہے: صدقۂ جاریہ یعنی ایسا نیک عمل جس کا نفع جاری رہنے والا ہو اور علم نافع جس کو حدیث میں "علم ینتفع بـــہ" کہا گیا ہے، یعنی نفع بخش علم جس کا فائدہ متعدی ہو اور نیک اولاد جو اپنے والد کو یاد رکھے جس کو حدیث میں کہا گیا ہے "او ولد صالح یدعولہ" یہ تینوں باتیں انہیں حاصل ہیں، کہ مدرسہ کا قیام وتاسیس ان کا صدقہ جاریہ، اور علم نافع کی صورت میں یہ علم دین جس کے لئے وہ تگ ودو کرتے رہے اور اس کے طلبہ ان کے فرزندان معنوی ہیں، اور صالح اولاد جو ان کی جانشین ہے اور ان کے کام کو آگے بڑھانے والی ہے، یہ تینوں خصوصیات اللہ نے ان کو عطا کیں۔ ذلك فضل اللّٰه يوتيه من يشاء.

جہاں تک ان کی خدمات کا تعلق ہے وہ مقامی اور بین الاقوامی دونوں طریقہ سے سامنے آئیں، قریب ہی مقام ہاتھرس میں ارتداد کی خبریں گزشتہ کئی سالوں سے موصول ہوتی رہی تھیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پراکٹر ڈاکٹر نفیس احمد صاحب اس کے لئے بڑے فکرمند رہا کرتے تھے، ان کی حوصلہ افزائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے اور وہ اطلاع احوال کرتے رہتے تھے، مدرسہ اور فاؤنڈیشن کے قیام کے بعد ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب نے اپنے تعلیمی میدان کو جو وسعت دی اس میں ہاتھرس کو بھی پیش نظر رکھا، وہاں مدرسہ قائم کیا، مسجدیں قائم کیں، دورے کئے اور مختلف جہت سے مسلمان ہوکر اسلام سے پھر جانے والوں کو دوبارہ اسلام پر یقین پیدا کرانے کا کام کیا، وہ ایک دینی مدرسہ کے قیام واستحکام سے ایک وسیع المطالعاتی اور کثیر المقاصد اسلامک دانشگاہ کے قیام کا عزم وحوصلہ رکھتے تھے، اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے خوابوں کی تعبیر ان ہی کی یادگار میں ایک عظیم انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے قیام کی شکل میں دیکھنے لگے تھے، اور اس کے لئے وہ کوششیں بھی شروع فرمادی تھیں جو اس کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں، جن میں دوسروں کو متوجہ کرنے کا ایک عمل مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی حیات وشخصیت اور دعوتی خدمات اور معارف وافکار پر بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد بھی ہے، جس کے متعلق راقم نے ان کی جو فکرمندی اور تڑپ دیکھی اس کے بیان کے لئے الفاظ نہیں ہیں، ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارہ نہ تھا کہ کوئی بھی قدم وہ اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ایما کے بغیر اٹھائیں، وہ ان کے انشراح کو بھی دیکھتے تھے، یہاں کانفرنس کے مرکزی موضوع اور ذیلی عنوانات ان سب میں وہ برابر مشورے کے لئے حضرت کے پاس تشریف لاتے اور جب حضرت نے محترم گرامی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ اور مولانا نذرالحفیظ ندوی ازہری دام مجدہ اور مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی صاحب سے مشورہ کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے ان سے مشورے بھی برابر حاصل کئے، وہ اپنی ذاتی حد تک ہمیشہ مشورہ کے ساتھ عمل پر کاربند رہے، مقامی سطح پر اپنے رفقاء کی ایک ایسی ٹیم بنالی تھی جس سے وہ مشورہ کرتے اور جب علالت نے شدت پکڑلی اور انہیں اپنی زندگی سے مایوسی

ہونے لگی تو اپنے فرزند وجانشین ڈاکٹر محمد سعد صدیقی زید توفیقہ ورشدہ کو ان اکابر اور رفقاء کی نشاندہی کی۔

اگر چہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کانفرنس میں ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم شرکت نہ فرما سکے تھے، لیکن اس کی کامیابی میں ان کی دعائیں ضرور شامل حال تھیں، ان کا پیغام جو کہ کانفرنس کا کلیدی خطبہ بلکہ خطبۂ صدارت تھا ان کی جگہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے پیش کیا، اور صدر اجلاس کے طور پر مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ نے شرکت فرمائی اور حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی مدظلہ بھی پورے اجلاس میں اپنی رہنمائیوں کے ساتھ شریک اجلاس بلکہ اس کے روح رواں رہے، عالم عرب سے اور افریقہ ویوروپ تک سے ممتاز داعیوں، اسکالروں اور مفکرین ودانشوروں کی تشریف آوری اور تقدیم بحوث ومقالات نے اجلاس کی اہمیت وافادیت یقیناً دوچند کردی تھی، اگر چہ علامۂ عصر شیخ یوسف القرضاوی بنفس نفیس شرکت نہ فرما سکے لیکن ان کے پیغام ومقالہ نے ان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا، اس کانفرنس ودعوتی اجلاس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ عالم اسلام موجودہ عالمی حالات میں اس وقت جس شخصیت کا خلا سب سے زیادہ محسوس کر رہا ہے وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ہے، اور ان کے دعوتی منہج وافکار کے فروغ واشاعت کی عالم اسلام کے حکام اور امراء وعلماء کو اور اسی طرح عوام الناس کو بھی شدید ضرورت ہے، جس کے لئے حکمت وتدبر اور رفق کے ساتھ اصلاحی ودعوتی کام کا تقاضہ ہے۔ حکومت واقتدار جس کو اللہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے، علماء ومصلحین کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے سبکدوش نہیں ہونا چاہئے، اور وہ حکمت کے ساتھ خواص وعوام دونوں طبقوں میں اصلاح ودعوت کا عمل جاری رکھیں، جس طرح سخت حالات میں امام حسن بصری، امام غزالی، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام، امام عبدالقادر جیلانی، امام ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ اور آخر میں حضرت مجدد الف ثانی امام احمد سرہندی، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت سید احمد شہید نے حالات کے اعتبار سے نمونے پیش کئے، اور یہ باور کرانا چاہا کہ انسانی دنیا کو جب جب ادبار وانحطاط کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ مسلمانوں کے کردار کی کمزوری اور ان کے دینی انحطاط اور داعیانہ مقام سے دستبردار ہونے سے ہوا ہے۔

اس بین الاقوامی کانفرنس سے یہ پیغام پوری اسلامی دنیا کو گیا، اور ایک عرصہ کے بعد جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات سے سامنے تھا پھر وہ یادیں تازہ ہوئیں، عقیدت مندوں کی آنکھیں اشکبار ہوئیں، یقیناً ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی صاحب مرحوم کو اس کانفرنس کے انعقاد سے بڑی مسرت تھی لیکن حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی عدم شرکت کا ملال اس سے کم نہ تھا اگر چہ وہ بدرجہ معذوری ومجبوری شرکت نہ فرما سکے تھے۔

اسی فرط تعلق کا اثر تھا کہ حضرت مولانا تلافیٔ مافات میں علی گڑھ کا سفر کر کے ان کے ادارہ تشریف لے گئے، اور دلجوئی فرمائی، جس کے وہ برابر ممنون رہے، راقم پر ان کی شفقت وعنایت ہمیشہ رہی اور اسے انہوں نے علی گڑھ قیام کی پیش کش بھی کی، بعد میں یہ تعلق بھی معلوم ہوا کہ وہ والد ماجد سید حسن حسنی صاحب مرحوم کے معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رفیق درس بھی رہے تھے اور ان کے ہم عمر تھے، افسوس اب صرف یادیں رہ گئی ہیں اور وہ اپنی باقیات صالحات کے ساتھ جا کر بھی اپنے محبین کے ساتھ ہیں، مدرسہ کا ہی ایک گوشہ ان کی آخری آرام گاہ بنا، جنازہ وتدفین میں شرکاء کی تعداد اتنی تھی جو علی گڑھ میں کم دیکھی گئی ہے، اور حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی مدظلہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، غفر اللّٰہ له وأدخله فی الفردوس الاعلیٰ.

☆☆☆

عشق سیہ پوش ہوا

(ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی)

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انسان کی سب سے بڑی اور اولین شناخت حسن سلوک اور اخلاق عالیہ ہے۔ قرآن کریم اور سیرت پاک کا یہی فرمان ہے کہ بندہ مومن خود کو مکارم اخلاق سے آراستہ کرے۔ اسی آرائش اور تکمیلِ اوصاف حمیدہ کا نام اسلام ہے۔ اسی صفات عالیہ کے حامل جناب ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی تھے۔ خوبصورت اور خوب سیرت دونوں تھے۔ توسع اور اعلی اقدار کی ایسی نمائندگی آج کے دور میں شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے کو ملے گی، غیاث صاحب کی مجلسیں علماء، جلیل القدر شخصیات، ارباب سیادت، پروفیسران، ٹھیلے والوں، ثروت مندوں اور غرباء سے ہمیشہ آباد رہی ہیں۔ ان کے یہاں ہر طبقہ کے لوگوں سے یکساں تخاطب اور ان کی باتوں پر یکساں التفات وانتباہ، ہر شخص کا اٹھ کر اور تبسم ریز ہو کر استقبال کرتے، ان کے یہاں طبقاتی ترجیحات کا کوئی تصور نہ تھا۔ ضیافت اور تکریم انسانیت کا پاس ولحاظ ان کے یہاں بہر حال تھا۔ اکثر دیکھا گیا کہ فجر سے بہت پہلے کبھی بذریعہ رکشہ تو کبھی بذریعہ کار اسٹیشن بھاگے چلے جارہے ہیں۔ کبھی ان کے اپنے ذاتی مہمان ہوتے اور زیادہ تر مدرسۃ العلوم یا دیگر ملی کاموں سے متعلقہ افراد ہوتے۔ ان کے قیام وطعام سے لے کر تمام ذمہ داریاں جناب غیاث صاحب پر ہوتیں۔ کبھی کبھی ان کے مہمان یونیورسٹی کے مہمان خانہ میں فروکش ہوتے تو دیکھا کہ اپنے جہازی ٹفن کے ساتھ ان کی توقیر وتکریم کے لیے حاضر ہیں۔ اس ضیافت میں نہ انھیں گھریلو ذمہ داریوں کا خیال اور نہ ہی اپنے مطب کا پاس ولحاظ، گویا ان کا سب سے محبوب ومرغوب مشغلہ ضیافت تھی۔ سید الضیوف مولانا ابوالحسن علی ندوی کے آنے پر تو ان کا حال دیدنی ہوتا۔ ہر آسائش وآرام ان کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کے لیے بے چین ہو جاتے۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی اور مولانا عبداللہ ندوی کی خاطر ومدارات میں اپنا سب کچھ جھونک دینے کے لیے تیار رہتے۔ یہی ان کا جذبۂ ضیافت مولانا سلمان ندوی کے ساتھ دیکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تعزیتی تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں جانے اور مختلف مقدر شخصیات سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن ان میں سب سے زیادہ با اخلاق، منکسر المزاج، اور خندہ مزاج دو صاحبان تھے۔ ایک ترکی کے نوری صاحب اور دوسرے جناب ڈاکٹر غیاث صاحب۔

ڈاکٹر غیاث صاحب کی ضیافت کے تعلق سے مختار مسعود صاحب آواز دوست یاد آرہے۔ وہ دبئی میں اپنے ایک علیگ دوست کے یہاں گئے تو دیکھا کہ گھر کے ایک ہال میں گیسٹ ہاؤس لکھا ہوا ہے۔ مختار مسعود صاحب اپنے دوست کو سخت وسست کہتے ہوئے مخاطب ہوئے کہ یار! تمہیں مادیت اتنی عزیز ہے کہ گھر کو گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا ہے۔ انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بے روزگار علیگ دوستوں کے لیے Without paying گیسٹ ہاؤس ہے۔ وہ یہاں رہتے ہیں، اپنی ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں اور برسر روزگار ہونے کے بعد یہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیتے ہیں۔ یہی حال غیاث صاحب کے مکان کے چھوٹے سے ہال

کا ہے جو ہر وقت مہمانوں سے بھرا رہتا ہے۔ کیوں کہ غیاث صاحب بھی ایک پکے علیگ ہیں، ان کی غیرت ایمانی ہمیشہ مہمانوں پر نچھاور رہتی تھی۔ ہمارے محترم مختار مسعود کی ملاقات غیاث صاحب سے ہوتی تو وہ اس حسین شخصیت پر ایک حسین خاکہ ضرور پیش کرتے۔ مختار مسعود صاحب اور ڈاکٹر غیاث صاحب دونوں کو علی گڑھ سے عشق رہا ہے۔ ایک عشق تہہ خاک ہوا اور ایک لاہور میں عصائے پیری کے ساتھ علی گڑھ کی تسبیح پڑھ رہا ہے۔

خاکسار کو غیاث صاحب کے مکان اور مطب پر صدہا بار جانا ہوا اور ہر بار تواضع کے لیے ان کے یہاں وہی اضطراب رہا۔ کیا مجال کہ کوئی ان کی ضیافت سے لطف اندوز ہوئے بغیر چلا جائے۔ آپ کی ضیافت کی انتہا تو دیکھیے کہ اِدھر جب سے صاحب فراش ہوئے اور بالکل مجبور محض بن گئے۔ اس وقت بھی عیادت کے لیے بار ہا گیا، دیکھتے ہی چائے اور دوائے کے لیے بے قرار، منع کرتا، کچھ نہ لینے کے لیے اصرار کرتا، لیکن ہر اصرار ان کی ضیافت کے حضور دم توڑ دیتا، تنہا خوری اور تنہا پا بر کاربی سے انھیں نفرت تھی۔ ہر وقت دو چار لوگوں کو لے کر سفر کرتے، تمام اخراجات آپ کے دوش قوی پر ہوتے۔

غیاث صاحب کے مطب کے بارے میں بھی کچھ کہنا ضروری ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد یہی مطب ان کی زندگی اور ذریعہ معاش تھا۔ بڑی بڑی سیاسی اور علمی شخصیات کی یہاں حاضری ہوتی۔ ادارۂ سرسید کے پروفیسران اس مطب کی زینت بنتے۔ اسی مطب نے انھیں گھر دیا، عزت دی، اور معاشرت میں ایک شناخت عطا کی۔ اسی سے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے سرفراز کیا۔ تقریباً اٹھارہ سال سے یہ مطب میری نظروں میں ہے۔ انھوں نے کبھی اسے ذریعہ معاش بنا کر نہیں چلایا۔ اکثر بیچ سے اٹھ کر معاشرتی خدمات کی ادائیگی کے لیے چل دیتے۔ دینی اور سیاسی جلسوں میں ان کی اکثر شرکت رہتی۔ اپنے گھر اپنے بچوں سے زیادہ معاشرے اور معاشرتی مسائل کی انھیں فکر لاحق رہتی۔ اگر مطب میں ہوتے تو تقریباً نصف مریضوں کو بغیر پیسے کے دوائیں دیتے۔ خاکسار اٹھارہ سالوں میں نہ جانے کتنی بار دوا لینے کے لیے گیا، لیکن سب کچھ کرنے کے بعد کبھی پیسے لیے ہوں ایسا کبھی نہ ہوا۔ خاکسار تو خاکسار اگر دوا لیتے ہوئے کسی نے میرا نام لے لیا تو اس سے بھی فیس لینے کا سوال نہ تھا۔ جب سے انھیں میرے رفیق کار (مجبوراً گھریلو ملازم) کا پتہ چلا تو اس سے بھی انھوں نے ایک حبہ لینا حرام تصور کیا۔ غیاث صاحب کو مادیت سے چڑ تھی۔ اس کے باوجود ان کے اس مطب اور جذبہ ایثار نے انھیں سب کچھ دیا۔ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوئے اور بیٹا اور راقم الحروف کے شاگرد ڈاکٹر سعد ماہی صدیقی تو فریشین بنے۔ قطر کے کسی ہاسپٹل میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ باپ کے تمام اوصاف بیٹے کے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ انتہائی مہذب، فرمانبردار اور والدین کی ہر آواز پر لبیک کہنے کے لیے ہمہ آن تیار، غیاث صاحب کی ڈیڑھ دو سالہ بیماری میں جس ذمہ داری اور باپ کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ باپ کی خدمت کے لیے وہاں سے بار بار آنا آسان نہ تھا۔ اپنے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے شب و روز ڈیوٹی انجام دیتے۔ اس طرح اتنا وقت مل جاتا کہ آ کر باپ کا آپریشن کرا سکیں اور آخری ایام میں ان کے ساتھ رہ کر ان کی خدمت کر سکیں۔ ایسا لائق بیٹا اللہ نے انھیں ان کی دینی خدمات کی وجہ سے دیا۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آپ مدرسۃ العلوم کے بانی ہیں۔ اور اس کی بناء کے لیے کس قدر مشقتیں اٹھائیں، کیسے کیسے موانع و عواقب سے آپ کو گزرنا پڑا؟ کن کن دروازوں پر دستک دینی پڑی؟ داستانِ بناء کبھی کبھی میرے سامنے بیان کرتے۔ ایک خاص مسلک کے ادارے کا قیام عمل میں آیا تو پریشان ہو گئے۔ بارہا انھوں نے ذکر کیا کہ ایک ایسے ادارے کے قیام کی شدید ضرورت ہے جہاں تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کے عقائد کو بھی تحفظ فراہم کیا جائے گا اور اس علاقے میں اشاعت شرک کے لیے اسے بطور بند کے قائم کیا جائے گا۔ ان کی دینی لگن اور شرک و بدعات کے سیلاب نے انھیں مدرسۃ العلوم کی تاسیس کے لیے آمادہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ میں اس کا قیام حد درجہ مفید ہے، اس کی بنیادوں میں خلوص مدفون ہے۔ جس کی وجہ سے دن بدن اس کی ترقی اور شہرت میں اضافہ ہوتا جا رہا

ہے۔ اس کا آغاز میرے سامنے ہے۔ چند ٹوٹے پھوٹے ہوئے کمروں سے ابتدا ہوئی، یوں ترقی کے زینے طے کرتا گیا۔ ۲۰۰۳ء میں مدرسۃ العلوم کا قیام عمل میں آیا، یوں صرف بارہ سالوں میں اب اس کی اپنی عمارت ہے۔ لائبریری ہے، ہاسٹل ہے، دوشاندار مسجدیں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سید سلیمان ندوی آئی ٹی آئی کی عمارت تیار ہے۔ خدا کرے اخلاص کا یہ سلسلہ رکنے نہ پائے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مہتمم جناب ڈاکٹر محمد طارق ایوبی صاحب نے اس ادارے کو تحقیق وتصنیف کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ سمینارز اور خطبات کا اہتمام پابندی سے ہوتا ہے۔ ۲۲۔۲۴ فروری ۲۰۱۴ء میں بین الاقوامی سمینار کے انعقاد سے اس ادارے کو خاصی شہرت ملی اور جناب ڈاکٹر ایوبی نے عربی مقالات بعنوان ''موقف الشیخ ابی الحسن علی الندوی من الافکار المعاصرۃ'' (۱۲ے صفحات) اور اردو مقالات بعنوان ''مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی'' (۸۸۸ صفحات) کی روداد شائع کر کے اس کے علمی وقار میں اضافہ کیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر ایوبی نے اپنی اور بعض دیگر تصانیف کو جامعہ کی طرف سے شائع کر کے اس کے تصنیفی کاموں کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ تمام مطبوعات مصارف طلب تھیں۔ ان تمام کاموں کی تکمیل کے لیے جناب ڈاکٹر غیاث صاحب اپنے کو پیس ڈالتے تھے۔ مالیات کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ ہے، لیکن مسائل ومصائب سے گزر کر یہ سب کام ڈاکٹر صاحب کر جاتے تھے۔ عیدالاضحیٰ کے تعلق سے در در جا کر کھالیں جمع کرتے، کھالیں اٹھانا اور انھیں رکشا پر اپنے ہاتھوں سے رکھنا ان کے لیے وقار کا مسئلہ نہ تھا۔ جب کبھی مل جاتے جامعہ کا ذکر چھیڑ دیتے۔ مختلف مسائل میں مشورہ کرتے۔ بڑے پیار سے ''سفیان بھائی'' کہتے۔ اس میں ایسا پیار اور ایسی قربت ہوتی کہ ہر شخص انھیں دل دے بیٹھتا۔ ہر بات مسکراہٹوں سے ہو کر گزرتی۔ سنجیدگی ان کی رفیق کار تھی۔ جامعہ کے تناظر میں یہ بات بھی بتانی ضروری ہے کہ جس کے لیے دھوپ میں تپنا، سردی سے کڑکڑانا اور باد وباراں سے جوجھنا سب کچھ گوارا تھا، جامعہ کے مہمانوں کی تواضع اپنی جیب خاص سے کرتے بلکہ یوں جانیے کہ بہاتے، انھیں صرف بہانا آتا تھا، بہا کر لوگوں کا دل جیتنا آتا تھا، مطب پر چائے پر چائے چلی آرہی ہے۔ اپنے اس بہانے کی وجہ سے عامۃ الناس اور ارباب علم وفضل دونوں میں مقبول ہوئے۔ مجھے بتانا تو یہ تھا کہ وہ اپنی ساری انرجی ادارہ پر خرچ کرتے لیکن اس کا ایک حبہ اپنی ذات پر خرچ کر لیں یہ ممکن نہیں۔ اس کی ایک چائے پینا بھی انھیں گوارہ نہ تھا۔ آپ کی کار اور آپ کے دو دو ملازم بھی اکثر جامعہ کے کاموں میں مصروف ہوتے۔ یوں جانیے کہ اکثر ہزاروں روپے کے پٹرول پھونک دیتے۔

مجھے یہاں پاکستان کے محمد ذاکر علی خاں یاد آرہے ہیں۔ جو کراچی کی سرسید یونیورسٹی کے بانی اور ماہنامہ ''تہذیب'' کے ایڈیٹر اور ایک درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں ''روایاتِ علی گڑھ'' کو انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ روایاتِ علی گڑھ کے تعلق سے تین اہم تصانیف منظر عام پر آئیں۔ آشفتہ بیانی میری، آواز دوست، اور روایات علی گڑھ، یہ تینوں تصانیف نہیں بلکہ علی گڑھ پر ڈکومنٹری فلم ہیں۔ انھیں ہاتھ میں لیتے ہی علی گڑھ کی فلم چلنے لگتی ہے۔ ان کتابوں کی ورق گردانی کرتے جایئے اور سرسید کے کارناموں کو دیکھتے جایئے، ان کے بغیر سرسید اور علی گڑھ تحریک کو سمجھنا ممکن نہیں۔ مجھے بتانا کیا تھا اور میں کس سمت بہک گیا۔ میں قارئین کے حضور یہ رکھنا چاہ رہا تھا کہ ذاکر صاحب نے اپنی تمام توانائی سرسید یونیورسٹی کی تعمیر وترقی میں لگادی لیکن اپنی چالیس پچاس سالہ زندگی میں اس کی ایک چائے بھی نہ پی۔ دن بھر اولڈ بوائز کے آفس میں براجمان رہتے۔ ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ میرے اندازے کے مطابق روزانہ ہزار بارہ سو ان کی مدارات پر صرف کرتے۔ اگر دیکھا جائے تو ذاکر صاحب اور غیاث صاحب کے بہت سے عادات میں تقارب وتشابہ ہے۔ دونوں کو بخالت سے ضد تھی۔ دونوں کے یہاں انکساری اور بے نفسی تھی۔ دونوں کو اشاعت علم اور ترسیل انسانیت سے عشق تھا۔ دونوں نے ادارے قائم کیے، دونوں کو اپنی مادر علمی علی گڑھ سے پیار تھا۔ ماہنامہ ''تہذیب'' کراچی، ذاکر صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا اور ماہنامہ 'ندائے اعتدال' غیاث صاحب کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ بس یوں

جانیے غیاث صاحب علی گڑھ تحریک کا حصہ تھے۔اس کا بنیادی مقصد فروغ تعلیم اور سائنٹفک سوچ کا احیاء ہے۔ اسی سوچ کے ہم نوا غیاث صاحب تھے۔غیاث صاحب کو سرسید اور علی گڑھ کے علاوہ اپنی اولین مادر علمی ندوۃ العلماء سے انتہائی عشق تھا۔ ندوہ کے تین فضلاء غیاث صاحب، مولانا عبدالعزیز بھٹکلی اور مولانا محمد الیاس بھٹکلی اپنی مادر علمی کے عاشق زار ہیں۔اس کی ترقی، نام ونمود اور لائحہ عمل کو ایک تحریک کی شکل میں لے کر چلتے ہیں۔ تینوں حضرات کے نزدیک ندوہ ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ندوہ کو تحریک کی صورت دینے میں علامہ شبلی کا کارنامہ ہے۔ یہ کارنامہ دن بدن بڑھتا ہی جارہا ہے۔ برگ وبار لاتا ہی جارہا ہے۔علامہ شبلی نے اپنے مقالات، مکاتیب اور خطبات کے ذریعہ ندوہ تحریک کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔فضلاء ندوہ کا اپنی مادر علمی سے والہانہ تعلق اور اس کی برپا کردہ تحریک سے جذباتی لگاؤ دیکھ کر رشک آتا ہے۔ یہی فیضان محبت کبھی فضلاء علی گڑھ میں تھا لیکن یہ دریائے محبت خشک ہوتا جارہا ہے۔یہی طغیانی کبھی متخرجین مدرسۃ الاصلاح میں تھی لیکن یہ دریا بھی اترتا جارہا ہے۔اس کی قرآنی تحریک ٹھنڈی پڑتی جارہی ہے، خدا کرے یہ تحریک جانبر ہو، برگ وبار لائے اور تا قیامت یہ تحریک، یونہی برپا رہے۔کیا ہی بہتر ہوتا کہ مجلّہ ''الاصلاح'' کی روایت ایک بار پھر عود کر آتی۔

ڈاکٹر غیاث صاحب کے بارے میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انھیں دو شخصیتوں سے پیار تھا۔ایک سرسید سے، ان کے پیار کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ادارے کو ''مدرسۃ العلوم الاسلامیہ'' کے نام سے موسوم کیا، اگر سرسید نہ ہوتے تو غیاث صاحب اس شہر علی گڑھ کا کیوں رخ کرتے اور یہاں مدرسۃ العلوم کی بنیاد کیوں ڈالتے۔ یہ سب سرسید کی قربانیوں کا کرشمہ ہے۔ جو مختلف شکلوں اور مختلف جگہوں پر نظر آرہا ہے، پر افسوس کہ کلکتہ کے ایک متمول تاجر نے سرسید کا گلا گھونٹنے کا عزم کیا تھا، لیکن وہ اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا، لیکن ہمارے ایک حاجی/ ہاجی سرسید کو سرزمین حرم سے سرسید کے لیے کفر کا فتویٰ لانے میں ضرور کامیابی ملی۔ غیاث صاحب کی دوسری محبوب شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تھی جس کی زندہ مثال مدرسۃ العلوم ہے جو ''علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن'' کے تحت چل رہا ہے، جس کسی کو ان دونوں شخصیتوں سے پیار ہوجائے تو وہ یقیناً ترسیل علم اور ابلاغ فضل کا شیدائی ہوجائے گا۔اور حصولِ مقصد کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگادے گا۔

یہ بڑے افسوس کے ساتھ لکھنے جارہا ہوں کہ علم وفضل کا ایسا مبلغ ،غرباء اور بے سہارا لوگوں کے لیے شعاع امید، عاشقِ سرسید، محبّ ندوہ، انسانیت کا داعی، انانیت سے دور رہنے والا یہ شخص ۱۷/ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو تہہ خاک ہوا۔ایک آفتاب تھا جو غروب ہوا بلکہ غالب کی زبان میں ''عشق سیہ پوش ہوا''۔ آج بے کسیٔ عشق پر ہمیں بھی رونا آرہا ہے اور لمحہ فکریہ تو یہ ہے ''کہ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد''۔غیاث صاحب ایک بہادر شخص کا نام تھا جو دو بڑے دماغی آپریشن سے گزرا لیکن یہ آپریشن اور یہ کینسر اس کے پختہ ارادوں کو متزلزل نہ کرسکے۔ادھر ایک سال سے صاحب فراش تھے لیکن لیٹے لیٹے مدرسۃ العلوم کے مسائل میں غلطاں وپیچاں رہتے۔ جب کبھی دیکھنے گیا تو مدرسۃ العلوم کے پروجیکٹ کو لے کر شروع ہوجاتے۔ بہرحال اس شخص کی کارفرمائیاں اس کے جنتی ہونے کی بشارت دے رہی ہیں، ویسے بھی جس نے دو مسجدیں تعمیر کرائیں ہوں اور جمال پور کی بڑی مسجد اور عیدگاہ والی مسجد میں جس کا ہراول کردار رہا ہو، ایسا شخص روایات کے مطابق جنتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اہل جمال پور کو شرک وبدعات سے تحفظ فراہم کرنے میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ یقیناً جمال پور کی ایک معتبر قیادت ہم سے چھن گئی۔ آنے والے دنوں میں اس کا شدت سے احساس ہوگا۔اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے اور ہم سب کے غیاث صاحب کو جنت الفردوس عطا ہو اور ان کے اہل خانہ خصوصاً بیٹے سعد کو اللہ صبر جمیل کی توفیق دے۔آمین۔

☆☆☆

کوئی محفل ہو، تیرا رنگ محفل یاد آتا ہے

محمد غزالی ندوی
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

دنیا سے ہر دن لاکھوں لوگ رخصت ہوجاتے ہیں، ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن کے جانے سے دنیا والے چین محسوس کرتے ہیں، کچھ وہ ہوتے ہیں جن کے جانے کا لوگوں کو غم ہوتا ہے، بعضوں پر صرف ان کے گھر والے روتے ہیں جبکہ بعض لوگوں کے جانے کا رنج ان کے محلے والوں کو بھی ہوتا ہے، لیکن ان سب سے ہٹ کر کچھ ایسے سعید نفوس اور ہر دل عزیز افراد بھی ہوتے ہیں جن پر پورا علاقہ بلکہ پورا ملک اشک بہاتا ہے اور مدتوں بہاتا ہے، ہمارے ڈاکٹر صاحب ایسی ہی نادر الوجود ہستی تھے جن پر کیا امیر کیا غریب، کیا عالم کیا جاہل، کیا عامی کیا خاص ہر شخص تصویر غم بنا ہوا ہے، جس سے پوچھیے وہی ان کی یادوں کے انمٹ نقوش کا تذکرہ کرکے سامان تسلی کر رہا ہے، میں نے اپنی زندگی میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کے تعلق سے ہر کس و ناکس نے اپنے دل میں اتنی حسین یادیں سجا رکھی ہوں، جس کسی سے بات کیجئے وہ ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ آتے ہی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنی آپ بیتی، گزرے ہوئے لمحات اور ان کی خوبیاں اس طرح بیان کرنا شروع کردیتا ہے، جیسے تسبیح کی لڑی توڑ دیجئے تو تسبیح کے دانے یکے بعد دیگرے ٹوٹنے لگیں، ہر دانہ یاقوت و مرجان، ہر کہانی اخلاقیات کا انمول خزانہ اور وضع داری و رواداری کا بہترین نمونہ۔

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سناتا جا رہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

اور۔

جہاں جائیں وہاں تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں
کوئی محفل ہو تیرا رنگ محفل یاد آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب میر کارواں تھے، اور کارواں کی قیادت کے لئے تمام ضروری اوصاف ان میں بدرجہ اتم موجود تھے، اقبال نے قوم کی امامت کے لئے جو نصاب تجویز کیا تھا وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

ڈاکٹر صاحب نہ صرف ان تین چیزوں کا مجموعہ تھے بلکہ ان کی مجلس مذکورہ صفات کی درسگاہ تھی، ان کے ساتھ بیٹھنے والوں کو بھی بقدر ہمت و حوصلہ ان صفات سے حصہ ملا کرتا تھا۔

ان کی نگہ بلند کا اندازہ ان کے عزائم سے کیا جا سکتا ہے جو بے انتہا بلند و بالا تھے، چھوٹے بڑے کئی مدرسے اور اسکول قائم کیے، آئی ٹی آئی قائم کیا اور اب بستر مرگ پر بھی ''علی میاں یونیورسٹی'' کا خواب سجاتے رہے جسے ان شاء اللہ ان کے ورثاء اور رفقائے کار شرمندۂ تعبیر کریں گے، زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ مکمل طور پر صاحب فراش ہو چکے تھے: کہتے تھے دل کرتا ہے کہ ایک مرتبہ بستر سے اٹھ جاؤں تو علی میاں یونیورسٹی قائم کردوں۔ وہ اسلامک بینکنگ سسٹم بھی ہندوستان میں لانے کے لئے کوشاں تھے، بارہا انہوں نے

مجھ سے کہا کہ ماہرین سے مل کر اس کا خاکہ بنانے کی ضرورت ہے۔

چونکہ نگاہ ہمیشہ عزائم پر رہتی تھی اس لئے کبھی اپنے آپ کو چھوٹی چھوٹی چیزوں میں نہیں الجھایا، کبھی کسی اختلاف میں نہیں پڑے، ہمیشہ امت کے وسیع تر مفادات کو پیش نظر رکھا اور اس کے لئے پست اور سطحی قسم کے اغراض ومفادات کو خاطر میں نہیں لائے، یہ بھی نگاہ کی بلندی اور وسعت ظرفی کی انتہا ہے کہ کبھی کسی پروگرام میں اپنے آپ کو آگے نہیں رکھا، سارے انتظامات خود کرنے کے باوجود عین پروگرام کے وقت اپنے آپ کو خدام کی فہرست میں شامل کر کے ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے دکھائی دیتے۔

ایک قائد کی دوسری صفت یہ ہوتی ہے کہ اس کا سخن دلنواز ہو، ڈاکٹر صاحب میں یہ صفت بھی تھی، اور کیا خوب تھی! چھوٹے بچوں کو بھی وہ بھائی کہہ کر پکارتے، ہم سب استاذوں کو ہمیشہ بھائی کہہ کر مخاطب کیا، غزالی بھائی، طارق بھائی، فرید بھائی، طلحہ بھائی، کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے کسی کی دل آزاری ہو، بارہا دیکھا کہ کسی قضیہ کے تعلق سے فیصلہ کرنے کے لیے میٹنگ بلائی جاتی تب بھی اور اسی طرح میٹنگ سے باہر بھی ہمیشہ دیکھا کہ اپنی رائے اس طرح ظاہر فرماتے "فیصلہ آپ لوگوں کو کرنا ہے، البتہ اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ"

ایک قائد کی شخصیت جن عناصر سے تشکیل پاتی ہے ان میں تیسرا عنصر جاں پرسوز ہے، یہی وہ عنصر ہے جو ایک رہبر و رہنما کی تحریر و تقریر اور اس کے کردار میں اثر انگیزی پیدا کرتا ہے، ساتھ ہی اس کی شخصیت کو ایک شعلہ جوالہ اور بے چین ومضطرب روح میں تبدیل کر دیتا ہے، یہ "جان پرسوز" ہی ہے جو عام انسانوں سے محیر العقول کارنامے انجام دلواتی ہے، جو سلطان صلاح الدین کو فاتح قدس، محمد الفاتح کو فاتح قسطنطنیہ اور ہزاروں علماء کی بھیڑ میں شیخ احمد سرہندی کو مجدد الف ثانیؒ بنا دیتی ہے۔ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اس صفت سے بھی وافر حصہ عطا کیا تھا، ملت کی فکر، اس کے درد اور امت کے لیے کچھ کر جانے کے عزم نے کس طرح ان کو آخر وقت تک تازہ دم وجواں سال بنا رکھا تھا اس کی کچھ جھلکیاں جناب اسماعیل سہسوانی صاحب کے مضمون میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اپنے مرشد ومربی حضرت مولانا علی میاںؒ سے جس طرح کا عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے اس میں وہ اپنی مثال آپ تھے، حضرت مولانا کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنا اصلاحی تعلق حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب اور مولانا عبداللہ حسنی صاحبؒ سے قائم کر لیا تھا، حضرت مولانا اور ان کے پورے خانوادہ سے وہ جس قسم کا نیاز مندانہ تعلق رکھتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مرض الوفات میں بار بار ڈاکٹر سعد صاحب کو یہ وصیت کی کہ مدرسہ اور فاؤنڈیشن حضرت مولانا رابع صاحب اور مولانا بلال صاحب کے مشورہ سے چلایا جائے اور تمام امور ان حضرات کی رہنمائی میں انجام دیئے جائیں، شدید علالت کے باوجود انتقال سے صرف تین مہینے پہلے سخت تکلیف اٹھا کر وہ اپنے پیر ومرشد مولانا رابع صاحب سے ملنے تشریف لے گئے، یہ محبت وشیفتگی کی وہ داستان ہے جس کی نظیر اس دور میں ملنی مشکل ہے۔

ہر ایک کا اکرام اور ہر ایک کی ناز برداری کرنا یہ تو ہم ہمیشہ دیکھا ہی کرتے تھے لیکن ایک بات ان کی وفات کے بعد معلوم ہوئی کہ ان کا یہی عمل اپنی اولاد کے ساتھ بھی تھا، وہ اپنی اولاد کی بھی عزت کیا کرتے تھے، ان کے صاحب زادے ڈاکٹر سعد صاحب کا بیان ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ بڑوں کا اکرام کرتے ہیں، اپنے بزرگوں کا کرتے ہیں، بعض جو بہت بااخلاق ہوتے ہیں وہ ہر آنے جانے والے کا خیال اور اس کی عزت کرتے ہیں لیکن کوئی انسان ہم نے ایسا نہیں دیکھا جو اپنے بچوں کا بھی اکرام کرتا ہو، لیکن ابا ہمارا بھی اکرام کیا کرتے تھے۔

ان کا کوئی بچہ بیرون ملک سے آتا تو حتی الامکان کوشش کرتے تھے کہ خود ایرپورٹ جائیں، اسی طرح واپسی میں حتی المقدور یہ کوشش ہوتی کہ دلی ایرپورٹ سے اپنے بچوں کو الوداع کہیں، جس نے ہر ایک کی ناز برداری ومزاج داری کی ہو اس کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے اگر لوگ سراپا کہانی بن جائیں تو اس میں تعجب کیا!!

☆☆☆

میرے مربی ومحسن جناب ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کچھ یادیں- کچھ باتیں

محمد اسمٰعیل سہسوانی
مسلم پبلک اسکول، جمال پور، علی گڑھ

نوٹ: حاجی محمد اسمعیل سہسوانی ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بڑے پرانے ساتھی ہیں، ۴۸ء سے تا دم آخر ساتھ رہا، ڈاکٹر صاحب پر جتنے حالات آئے سب میں شریک رہے، ان کے سیاسی، سماجی، ملی اور تعلیمی سبھی کاموں میں ساتھ رہے، انھوں نے اپنی یادیں قلم بند کی ہیں، ادارہ اس کرم فرمائی پر ان کا ممنون احسان ہے۔ (مدیر)

علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری محترم محمد غیاث صدیقیؒ کی رحلت نے عالم اسلام کا غمگسار اور سرمایہ ملت کا نگہبان چھین لیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھے۔ فقر واستغنا کے پیکر اور ایثار وقربانی کے پتلے تھے۔ خالق نے انہیں بے بہا اوصاف وصفات سے نوازا تھا۔ مہر ووفا، شرافت ومروت، اخلاص وانکساری ان کی رگ رگ میں پیوست کردی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو نزدیک سے جاننے والے حضرات ان کی فرشتہ صفت خوبیوں سے واقف ہیں۔ ان صفات کا انسان چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔

رونق انجمن گل تھا جو لالۂ نہ رہا
ناز تھا جس پہ وہ سرو قد بالا نہ رہا

ڈاکٹر صاحب سے راقم السطور کی پہلی شناسائی جہاں تک یاد پڑتا ہے آج سے تقریباً پینتیس چھتیس سال قبل موضع رٹھگواں میں ہوئی، جہاں ڈاکٹر صاحب کی کلینک تھی، جو علی گڑھ سے تقریبا پانچ کلومیٹر پر واقع ہے۔ روزانہ صبح وشام اور کبھی دوپہر میں آمدورفت تھی۔

راستہ بہت خطرناک تھا۔ خاص طور پر برسات کے موسم میں، اور پھر چاروں طرف جھاڑیاں تھیں، جہاں راستے میں لٹیرے بیٹھے رہتے تھے اور آنے جانے والوں کو لوٹ لیتے۔ مگر ڈاکٹر صاحب موصوف کے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے آپ کو ٹچ نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ شام کے وقت موضع مرزا پور سے پیدل علی گڑھ جارہا تھا، ڈاکٹر صاحب رٹھگواں سے آرہے تھے، برسات کا موسم تھا، کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب نے کہا اسماعیل بھائی آپ میری سائیکل پر بیٹھ جائیں، بس اتنی دیر میں شدید بارش شروع ہوگئی، راستے میں رکنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، راستہ کا اندازہ نہیں ہورہا تھا۔ اس مردِ مجاہد کے الفاظ تھے اسمٰعیل بھائی اصل زندگی یہی ہے۔ شاید اس کے کچھ ماہ بعد ہی جمال پور چودھری صاحب کی مارکیٹ میں ایک دوکان مل گئی، جس میں کلینک شروع کی، کلینک کی پشت میں رہائش کا انتظام ہوگیا۔

الحمدللہ کلینک پر اتنے مریض آتے کہ راستہ جام ہوجاتا۔ دوپہر میں یا کبھی رات میں حاضر ہوتا تو ڈاکٹر صاحب فرماتے محلے میں کام کی ضرورت ہے، ان کو تعلیم کی طرف رغبت دلائی جائے، پھر لوگوں

سے مراسم بڑھے، ان کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرنے کی حکمت وفراست کے ساتھ ان کی فاروقیت کے سامنے فتنے کافور ہوئے اور وہ جہاں ہوں شیطان کے لئے مایوسی کے سوا چارہ نہ تھا۔

چنانچہ اپنے تدبر، دور بینی و دور نگاہی سے محلے کی اندرونی فضا کو انہوں نے گہوارۂ امن بنادیا۔ پھر لوگ آپ سے اپنے ذاتی مشوروں اور فیصلوں کے لئے آنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب اخلاق کے پیکر اور صبر کے پہاڑ تھے جس کی برکت سے اللہ نے ان کی زبان پر حکمت کا فیضان کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک فطری قائد تھے، اللہ نے انہیں بے پناہ صلاحیت بخشی تھی۔ اس سے انہوں نے لوگوں کو بھرپور فائدہ پہنچایا۔ شاید کوئی دن ایسا گذرا ہو کہ لوگ آئے ہوں اور ڈاکٹر صاحب کے سامنے اپنے مسائل نہ رکھے ہوں اور ڈاکٹر مرحوم انہیں حل نہ فرماتے ہوں۔

بسا اوقات مشغولی بھی ہوتی، مگر واہ رے عزم! کہ مرحوم نے کبھی بھی کسی کو واپس نہیں کیا، ایسے معاملات میں کبھی اپنی پسند و ناپسند کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ تاریخ جب بھی لکھی جائے گی ڈاکٹر مرحوم کا نام نامی انشاءاللہ نمایاں رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس لحاظ سے آزاد تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو کسی خاص مسلک یا جماعت سے شدت کی حد تک منسلک نہیں رکھا، وہ کبھی تبلیغی جماعت کی مدد کرتے، کبھی دیگر جماعتوں کے پروگرام میں ان کو قریب کرنے کے لئے چلے جاتے، آزادرہ کر مختلف انداز میں دین کی خدمت کی، ان کی حکمت سے جمالپور میں بدعات کا اثر کم ہوا، کئی مسجدوں میں تبلیغی جماعت کی آمد و رفت شروع ہوئی، ڈاکٹر مرحوم کی خصوصیت تھی کہ وہ تشدد کے ساتھ اپنے اوپر کسی جماعت کو طاری نہ کرتے، اس لئے کہ وہ ندوی الفکر تھے، جو جس طرح بھی دین کی خدمت کرتا بس اس کی مدد اور تعاون کو اپنا فرض سمجھ لیتے۔

۱۹۸۹ء میں نگر پالیکا کا الیکشن ہوا، اس میں کچھ احباب نے زور دے کر الیکشن میں کھڑا کر دیا۔ جس میں آپ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد آپ کو نزول کا چیرمین بنادیا گیا۔

اس سے قبل آپ نے سیرت کمیٹی قائم کی، اس کے تحت مختلف پروگرام کئے، جس میں اسکولوں کے طلباء و طالبات کو دین کی رغبت دلانا اور دینی معلومات فراہم کرنا مقصود ہوتا، پروگرام میں شریک طلبہ کو قیمتی انعامات سے نوازا جاتا، سیرت کمیٹی کے تحت ۱۹۸۷ء میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کرایا جس میں نامور شعراء کرام حفیظ میرٹھی، بسمل صاحب وغیرہ تشریف لائے۔ فلاح و بہبود کے کاموں کو آگے بڑھانے کے لئے ایک کتاب ''سیرت کمیٹی اور اس کا تعارف'' تصنیف کی۔ اور اس کے تحت آپ کی سرپرستی میں مسلم پبلک اسکول قائم ہوا، جب جمال پور کی بڑی مسجد سے اسکول منتقل ہوا تو اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مسجد میں مدرسۃ مدینۃ العلوم قائم کیا۔ اور وہیں ندوۃ العلماء کے اکابرین اور شہر کے علماء و دانشوران کے مشورے سے ندوہ کی شاخ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کی شروعات کی گئی۔

قوم کی فکر ہر لحہ ستاتی رہتی، چاہے وہ کلکٹریٹ تک پیدل میمورنڈم پہنچانا ہو یا جلسے جلوس کی شکل ہو، چاہے وہ بیت المقدس کی بازیابی ہو یا بابری مسجد کے انقلابی نعرے، قیادت ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہی ہوتی تھی۔ جب بابری مسجد کا سانحہ ہوا اور چاروں طرف فساد کی آگ بھڑک رہی تھی، آپ پر بے چینی طاری تھی۔ جب جب اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ڈاکٹر صاحب قبل از وقت پیشن گوئی کرتے، ایسا معلوم ہوتا جیسے آپ کو کشف والہام ہوا ہو۔ بابری مسجد کے سانحہ پر حالات بڑے ناگزیر تھے۔ علی گڑھ کے اطراف کے گاؤں کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے بے سروسامان پریشانی کے عالم میں آگئے یہاں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پر عجیب کیفیت طاری تھی جگہ جگہ کیمپ لگوائے، مہاجرین کے لئے لحاف، ٹھنڈے گرم کپڑے، کھانے پینے کی اشیاء یہاں تک کہ نہانے دھونے کے صابن اور جو لوگ بیڑی پینے کے عادی تھے

ان کے لئے بیڑی کا انتظام کیا۔

چاروں طرف فساد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ یہ مردِ مجاہد اس ناچیز کو ساتھ لے جا کر گھر گھر جا کر لوگوں کی خیریت معلوم کرتا، گاؤں سے آئے پریشان حال لوگوں سے الگ الگ ملاقات کرتا۔

اس ناچیز کو لے جا کر ان کی پوری رپورٹ تیار کی جاتی، جو لوگ زخمی تھے ان کے علاج معالجہ کا انتظام کیا جاتا اور جو شہید ہو گئے تھے ان کی رپورٹ کا اندراج کرایا جاتا۔

ہمارے ہی کچھ لوگ منافقین ہوئے جنہوں غیر مسلموں سے ڈاکٹر صاحب مرحوم پر جھوٹی ایف آئی آر کرائی، فساد کے دوران ڈاکٹر صاحب کے مکان پر شر پسند پی۔ اے۔ سی۔ والے گھس گئے، توڑ پھوڑ، آگ زنی، لوٹ مار کی یہاں تک کہ اب ڈاکٹر صاحب کی تلاش کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتلایا: اسمٰعیل بھائی میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اور وہ دس پندرہ تھے، بس میں اللہ سے رجوع کئے تھا، ایک بھی پولیس والا مجھے نہیں دیکھ سکا، سب کی آنکھوں پر اللہ نے پردہ ڈال دیا۔ اللہ جسے رکھے اسے کون چکھے۔ بس اللہ جس کی حفاظت کرے، اس کے بعد آپ کی گرفتاری ہوئی، آپ کو جیل جانا پڑا۔

یہ ناچیز جیل میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے پہنچا تو چمٹا لیا اور فرمایا: اسمٰعیل بھائی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہمارے پیارے نبیؐ اور صحابہؓ اور بزرگان دین پر بے شمار پریشانیاں آئیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کہنے لگے جب آپ کل آئیں تو ایک آل آؤٹ، ایک عطر کی شیشی اور سیرت سید احمد شہیدؒ ضرور لیتے آئیں۔ معلوم ہوا کہ آپ جتنے روز جیل میں رہے روزانہ سیرت سید احمد شہیدؒ کی تعلیم فرماتے اور نماز باجماعت کا اہتمام کرتے۔

آپ میرے مربی و محسن، میرے سفر کے ساتھی، حضر کے ساتھی، میرے مشیر، اور میرے رازداں تھے، ناچیز سے بے پناہ محبت تھی اور اعتماد تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ میرا پہلا سفر ۱۹۸۲ء بھوپال تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لئے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی انجمن دینی تعلیمی کونسل سے وابستگی تھی، بہت جگہ مکاتب قائم کئے، کئی مکاتب کے مدرسین کو اپنی جیب خاص سے تنخواہ دیتے تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سکریٹری انجمن تعلیمات دین لکھنؤ موصوف سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ناچیز کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کئی مرتبہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے دولت کدہ پر جانے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر قریشی صاحب ڈاکٹر محمد غیاث صاحب مرحوم کی کس قدر احترام کے ساتھ ضیافت فرماتے ہیں، اسی انجمن کے سلسلے میں مرادآباد کا سفر ہوا جو پندرہ اضلاع کی کانفرنس تھی، صدارت مولانا علی میاںؒ کی تھی۔ اس سفر میں سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر اے۔ ایم۔ یو۔ اور پروفیسر نفیس احمد صاحب ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے توصل سے اس ناچیز کو ان بزرگوں کی صحبت اور ان سے استفادہ کا خوب خوب شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد بھٹکل کرناٹک تین مرتبہ سفر ہوا اور لکھنؤ تو بہت بار آمد و رفت رہی، ایک مرتبہ میرے وطن سہسوان غریب خانہ پر ایک تقریب میں شرکت کی، میرے والد محترم کا بڑا احترام کرتے تھے۔ میرے سلسلے میں گفتگو کے دوران بڑی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ایک دوسرے موقع پر بریلی میں مدرسہ بورڈ کی تقرری کے موقع میں جانے کو کہا: کہنے لگے آپ کو بالکل نہیں جانے دوں گا۔ یہاں کام کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ان کی والہانہ محبت تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دیرینہ خواہش تھی کہ علی گڑھ میں ایک بڑا ادارہ قائم ہو جس کی شروعات جمال پور کی بڑی مسجد سے کی، اللہ پاک نے ان کے دیرینہ خواب کو پورا کیا اور ایک بڑا ادارہ جو ندوۃ العلماء کی شاخ ہے قائم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ اب ندوہ یونیورسٹی قائم ہو جائے۔

کلینک پر عشاء کے بعد روزانہ حاضری ہوتی، چاہے سردی ہو یا برسات، اگر کسی وجہ سے دیر ہو جاتی تو ڈاکٹر صاحب فون کرتے، کہتے کہاں ہو، انتظار ہو رہا ہے۔ کلینک کیا تھی۔ خانقاہ بھی، قہوہ

خانہ بھی، محفل خانہ بھی، کبھی قہقہوں کا دور ہوتا تو کبھی دینی مسائل پر بحث ہوتی، کبھی بزرگوں کے تذکرے، تو کبھی شعراء کی محفل جمتی، کبھی پر لطف مذاق، کبھی دورِ حاضر پر گفتگو ہوتی، تو کبھی سیاسی تبصرے ہوتے۔ کلینک پر کوئی مریض آتا اور ان کو یہ احساس ہوجاتا کہ یہ پریشان ہے یا وہ اظہار کر دیتا تو آپ اس سے پیسے نہیں لیتے بلکہ اس کو دودھ یا پھل کھانے کے لئے علیحدہ سے پیسے دیتے۔ دیکھنے میں اکثر آیا کہ ایسے لوگ جو شرابی یا دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتے ڈاکٹر صاحب اٹھتے، انہیں سمجھاتے اور پھر ان کی خاموشی سے مدد کرتے، ڈاکٹری کے پیشہ کے ساتھ یہ اوصاف واقعی بے مثال ہیں آج کل تو اس پیشہ سے متعلق حضرات کے بارے میں میں اکثر یہ دیکھنے ملتا ہے کہ وہ اپنی جیب بھرنے کی خاطر کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے، چاہے مریض مرجائے، اس کا کچھ بھی ہو، مگر ان کا دل نہیں پسیجتا، ایسے زمانہ میں مرحوم کے یہ اوصاف یقیناً لائق اتباع اور قابل تقلید ہیں۔

ایک رکشے والا غیر مسلم تھا، اکثر ڈاکٹر صاحبؒ اس کے رکشے سے جاتے تھے، تو اکثر وہ باتیں کرتا جاتا تھا، اور کلمہ سناتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کلمہ سنانے کے علیحدہ سے سو روپے کا نوٹ دیتے تھے۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں۔ ناچیز کبھی اعتراض کرتا تو فرماتے: اسمٰعیل بھائی یہ ضرورت مند ہیں، ہوسکتا ہے اسی طرح یہ راہِ راست پر آجائیں اور میرا بیڑا پار ہوجائے۔

مرنا سب کو ہے، اس سے چھٹکارہ نہیں، ۶/ اکتوبر ۲۰۱۵ء بروز منگل بوقت مغرب تقریباً پونے چھ بجے ڈاکٹر صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور خالقِ حقیقی سے جا ملے، امت کے ہزار ہا ہزار افراد نے نمازِ جنازہ کے بعد سیکڑوں من مٹی تلے قیامت تک کے لئے آپؒ کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ رب کرے ان پر نچھاور ہر گھڑی رحمت کے پھول۔

☆☆☆

(**بقیہ صفحہ ۵۸ کا**) ..... ہر کس وناکس کی آنکھ نم اور دل مغموم تھا، علی گڑھ مختلف تحریکات اور نظریات کا گہوارہ ہے لیکن آپ کے جنازہ میں مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے اور سب کے چہرے ڈاکٹر صاحب کے سانحۂ ارتحال کو لے کر غم زدہ تھے، اور کیوں نہ ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب سب کا اکرام کرتے، سب کی ادنیٰ سی دعوت پر لبیک کہتے، کبھی آپ تبلیغی جماعت کے حلقوں میں، تو کبھی جماعت اسلامی کے مرکز میں نظر آتے۔ وقت پڑنے پر سیاست کے گلیاروں میں بھی آپ نے قدم رکھا۔ مختلف ملی تحریکوں سے وابستہ رہے، لیکن کبھی اخلاص وللّٰہیت کا دامن نہ چھوڑا۔

بزرگوں اور ملت کے بہی خواہوں سے ہمیشہ ملتے رہتے، اہل علم کی قدر کرتے، رمضان المبارک کے مہینہ کے آخری عشرہ میں ہمیشہ بزرگوں کی بستی رائے بریلی تکیہ کلاں میں اعتکاف فرماتے، یہاں تک کہ اپنی زندگی کے آخری ماہ مبارک میں بھی ایک شب وروز یہی گذارا، پہلے آپریشن کے بعد آپ کے سعادت مند بیٹے ڈاکٹر سعد صدیقی آپ کو عمرے پر لے کر گئے۔

اللہ نے آپ کو دنیا میں بہت نوازا تھا، نہ آپ کے پاس مال و زر کی کمی تھی، نہ عزت وشہرت کی، آپ ایک خوشحال خاندان کے ذمہ دار تھے، اگر چاہتے تو بہت اچھی زندگی گزارتے، جیسا کہ امرائے دنیا کا طریقہ ہے کہ اپنی ذات کے علاوہ ان کو کچھ نہیں سوجھتا، اپنی عزت اپنی شہرت میری اولاد، میرا پیسہ، میرا پیٹ، لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب ہمیشہ دوسروں کے لئے جیتے تھے، آپ نے اپنے تمام عیش وآرام کو تج دیا بلکہ اپنا سب کچھ راہ خدا میں لٹا دیا۔

سب کچھ لٹا کے راہِ خدا مین اہل دل
خوش ہیں کہ دولت کونین پاگئے

خود ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ میں نے کبھی اپنے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا، لیکن جب سے مدرسہ قائم کیا ہے شام کو یہ سوچ کر سوتا ہوں کہ صبح کس کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے۔ آہ! بڑی خوبیاں تھی مرنے والے میں۔

ڈاکٹر صاحب چلے گئے لیکن آپ نے اپنے پیچھے ایسے لہلہاتے چمن زار چھوڑے ہیں جن کے جھروکوں سے آپ کی روح کو سکون مل رہا ہوگا، اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنے شایان شان جزاء عطا فرمائے۔

☆☆☆

ہم نے ایسے بھی زمانے میں قلندر دیکھے

(مولانا ڈاکٹر غیاث صدیقی ندوی مرحوم، کچھ یادیں، کچھ باتیں)

محمد قمر الزماں ندوی

جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی

موت کا ایک وقت سب کے لئے معین ہے اور یہ ہر اس مخلوق کا انجام ہے جو متاع زیست سے گراں بار اور زندگی کے مرض الموت میں گرفتار ہے۔ لیکن بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں جو دل کا داغ اور سینے کا چراغ بن جاتی ہیں، جو اپنی خدمات کے وہ تابندہ نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو صدیوں جگمگاتے رہتے ہیں، جن کے ذکر سے افراد کے دل معمور اور ان کی جدائی سے قلب رنجور ہوتے ہیں۔ ان کا حادثۂ وفات قوم وملت اور سماج ومعاشرہ میں ایک خلا پیدا کرتا ہے جسے پر کرنا بظاہر مشکل ہوتا ہے۔ جناب ڈاکٹر غیاث صدیقی ندوی کا انتقال ۶/ اکتوبر کو ہوا، تقریبا پندرہ دن گزر گئے لیکن ان کی یاد کی شمع دل میں فروزاں ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب ایک سانحہ تھا ہو گیا

اس حادثے کا اثر ہر اس باشعور انسان کے دل پر ہوا اور ابھی تک ہے جو ان کی ذات، خدمات اور قربانیوں سے واقف ہے کیوں کہ وہ اپنے ناخنِ تدبیر سے ملت کے عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی کرنے والوں میں سے ایک تھے، وہ دلِ دردمند کے ساتھ فکر ارجمند کے مالک تھے اور جب ایسی ستودہ صفات ہستی دنیا سے اٹھتی ہے تو ایک خلا چھوڑ دیتی ہے اور یہ خلا صرف اس وقت پر ہوتا ہے جب اس خلا کے پیدا کرنے والے کی مشیت ہوتی ہے۔

مجھے مرحوم کی زندگی کے ابتدائی حالات، تعلیم وتربیت، ندوۃ العلماء سے فراغت، علی گڑھ میں داخلہ، ڈاکٹریت کی تکمیل، علی گڑھ میں مطب کی شروعات اور وہاں کی سیاسی زندگی اور مصروفیات کے بارے میں ادنی واقفیت نہیں ہے اس لئے اس پیوند خاک کے بارے میں کچھ بھی خامہ فرمائی نہیں کرسکتا، یہ حق وہی ادا کرسکتا ہے جو مرحوم کا رفیق، معاون اور دم ساز رہ چکا ہو اور ان کے وہ معاصرین اس حق کو ادا کریں گے جن سے ان کا رابطہ اور تعلق فراغت کے بعد بھی قائم رہا، میں نے تو اس گوہر شب چراغ کو اس عمر میں دیکھا جب اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے قریب ہو گیا۔ میرا ان سے باضابطہ تعلق اور رابطہ چند سالوں کا رہا ہے، اس لئے یہاں تو دامانِ نظر ہی تنگ ہے اور ان کے حسن و جمال، صورت وسیرت، گفتار وکردار اور اوج کمال کے پھول بسیار اور بے شمار ہیں۔

محض حافظہ کی بنیاد پر یہ کہنا مشکل ہے کہ ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب ندویؒ کا نام سب سے پہلے کب اور کن سے سنا، البتہ اتنا یاد ہے کہ ان سے سب سے پہلی ملاقات راقم السطور کی اس وقت ہوئی جب میں دہلی میں آل انڈیا ملی کونسل کے ایک پروگرام میں شرکت سے واپسی کے بعد پہلی بار علی گڑھ آرہا تھا، اور مقصود یہ تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کو دیکھوں، اور ہمارے بعض عزیز اور شاگرد جو وہاں زیر تعلیم تھے ان سے ملاقات کروں، اتفاقا انہیں دنوں ہمارے شیخ ومربی اور استاد داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی صاحبؒ علی گڑھ تشریف لائے ہوئے تھے، اور غالبًا حکیم کلیم اللہ صاحب کے یہاں مہمان تھے، دہلی کے اس سفر میں میرے ساتھ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ کے نائب مہتمم جناب مولانا مشہود السلام ندوی (حال استاد ندوۃ

العلماء) ساتھ تھے، یہ ۱۹۹۸ کی بات ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم سے پہلی ملاقات علی گڑھ میں اس وقت ہوئی جب احقر حضرت مولانا عبداللہ حسنیؒ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے گھر پر عشائیہ پر مدعو تھا۔

اس وقت ڈاکٹر صاحب کی حسن سیرت اور حسن صورت نیز ان کی خاکساری، تواضع اور انکساری، دین کے لئے درد اور تڑپ کا جو مشاہدہ کیا اس نے راقم السطور پر گہرا اثر ڈالا، ڈاکٹر صاحب نے اس دعت طعام کو دینی دعوت میں بدل دیا تھا، کھانے میں بہت سارے پروفیسران اور عمائدین شہر کو بھی مدعو کیا تھا۔ عشائیہ سے قبل حضرت مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ نے "حالات حاضرہ اور خواص کی ذمہ داریاں" کے عنوان پر بہت ہی مفید گفتگو فرمائی اور حاضرین کے سوالوں کا تشفی بخش جواب دیا۔

یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے پہلی ملاقات تھی جس کی یادیں ابھی تک ذہن وحافظہ میں مرتسم ہیں۔ پھر درمیان میں ایک بڑا وقفہ رہا جس میں میں ڈاکٹر صاحب کے دیدار سے محروم رہا، البتہ بعض ندوی احباب اور شاگردوں سے ان کا تذکرہ گاہے بگاہے سنتا تھا کہ وہ بی یو ایم ایس میں داخلہ لینے والے ندوی طلباء کے لئے مفید اور معاون ثابت ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں ان طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ پھر جب مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کی ڈاکٹر مرحوم صاحب نے داغ بیل ڈالی اور ندوۃ العلماء سے اس کا الحاق کرایا اور وہاں سے ماہنامہ "ندائے اعتدال" کا اجراء ہوا تو سرِ ورق کے بعد والے صفحہ پر زیر نگرانی ڈاکٹر غیاث صدیقی کا نام دیکھا۔ تو احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے اندر جو جوش، جذبہ اور فعالیت ہے اس سے یہی امید ہے کہ انشاء اللہ یہ ماہنامہ ضرور مقبول ہوگا اور قوم وملت کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ الحمدللہ اس رسالہ کا شمار آج ہندوستان کے چند گنے چنے اور منتخب رسالوں میں ہوتا ہے۔

اور یہ دیکھ کر مزید خوشی ہوئی کہ نوجوان فاضل ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی اس کے ایڈیٹر ہیں اور میرے تین انتہائی عزیز شاگردوں میں سے آدم علی ندوی نائب مدیر ہیں، اور محمد امجد ندوی اور بخل حسین ندوی مجلس ادارت کے رکن ہیں۔

انہیں دنوں راقم السطور کے نام مدرسۃ العلوم کی طرف سے ایک سیمینار کے لئے ایک دعوت نامہ موصول ہوا جس میں داعیان میں ڈاکٹر غیاث صاحب صدیقی ندوی، پروفیسر مسعود خالد اور ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی کے نام تحریر تھے۔ سیمینار کا موضوع تھا "علی گڑھ کی دو اہم شخصیتیں مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، حیات وخدمات" لیکن بعض حالات اور وجوہات کی بناء پر یہ سیمینار منعقد نہ ہوسکا۔

مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ ڈاکٹر صاحب جب رابطہ ادب اسلامی کا اور حضرت مولانا علی میاں ندوی کی شخصیت پر اتنا کامیاب سیمینار کرسکتے ہیں تو آخر یہ سیمینار التواء کا شکار کیوں ہو گیا، میں نے ایک موقع پر جب ڈاکٹر صاحب سے اس پر استفسار کیا تو کہنے لگے کہ ان دونوں حضرات پر لکھنے کے لئے جب اہل علم کو دعوت نامہ بھیجا گیا تو بمشکل تمام دو چار مقالے ہی دستیاب ہوسکے۔ ویسے بھی ان دونوں حضرات پر مراجع کی کتابیں بہت کم ہیں اور اول الذکر کے حالات تو بہت کم ملتے ہیں اور ثانی الذکر کے جاننے والے اب دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں۔ ان کی زندگی پر ڈاکٹر شمس الدین صاحب کی کتاب صدر یار جنگ ہی ایک واحد بڑا مرجع ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے جو روشن اور تابناک پہلو ہیں اور ان کی جو انفرادی خصوصیات وامتیازات ہیں ان پر ان کے جاننے والے لکھیں گے، خاص طور پر ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی جن کو قدرت کی طرف سے تحریر وتقریر کا ملکہ حاصل ہے اور جو ان کی زندگی کے نشیب وفراز سے اور ان کی متحرک اور فعال زندگی سے ان کی اولاد کے بعد سب سے زیادہ واقف ہیں (بلکہ میں تو ایوبی صاحب کو ان کی روحانی اولاد سمجھتا اور خیال کرتا ہوں) اس حق کو ادا کریں گے۔ میں انتہائی اختصار کے ساتھ ڈاکٹر مرحوم کی سرگزشت حیات کے ان پہلوؤں کو اجاگر کروں گا جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا اور جن کا مشاہدہ میں نے ان کی زندگی میں کیا۔

(۱) راقم الحروف اپنی طالب علم کی زندگی میں بار بار ایک ایک جملہ سنتا تھا۔ "ایک شخص ایک کارواں" لیکن اپنی معنویت کے اعتبار سے ہوش سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے جس شخصیت پر یہ جملہ صادق آیا وہ عالمی سطح پر مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی ذات گرامی تھی۔ اور قومی اور صوبائی سطح پر جن شخصیتوں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور کارواں تھے تو اس فہرست میں درجنوں اور سینکڑوں نام میرے ذہن اور حافظہ میں

موجود ہیں۔ان میں ایک نام ڈاکٹر غیاث صدیقی کا بھی ہے۔ میں بلا مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی حیات مستعار کے ان ایام میں جن فعال اور انقلابی شخصیتوں کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر صاحب مرحوم کا بھی ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سراپا حرکت تھے، دین اور علم دین کی اشاعت اور سربلندی ان کا مشن تھا، مرحوم عملی انسان تھے، صرف نظری اور فکری انسان نہیں تھے جو کچھ سوچتے اور طے کرتے اس پر پوری سرگرمی سے عمل کرتے۔ رابطہ ادب اسلامی کا پروگرام، حضرت مولانا علی میاں ندوی پر عالمی سیمینار اور آل یوپی مدارس ملحقہ دارالعلوم ندوہ کا مقابلہ ان کی عملی سعی و کوشش اور جہد و جہد کے شاہد ہیں۔ میں ان کی پارے سے مثال دیتا ہوں کہ یہ ایک جگہ جم کر بیٹھ نہیں سکتے، وہ ہمیشہ تحریکی ذہن رکھتے تھے۔

(۳) ڈاکٹر مرحوم جس کام اور منصوبے کو مفید سمجھتے، اس میں جی جان سے لگ جاتے تھے، بلکہ شب و روز اس کام کو اوڑھ لیتے تھے، اس کے لئے ہر طرح کی جانی اور مالی قربانی بھی پیش فرماتے تھے ڈاکٹر صاحب مرحوم چونکہ کثیر الاولاد تھے اور ان کے متعلقین اور رشتہ دار خوش حال اور صاحب ثروت تھے اس لئے بہت سے منصوبے اور کاموں میں ان سے مالی تعاون حاصل کرتے، اور آسانی کے ساتھ وہ منصوبہ اور کام پورا ہو جاتا۔

(۴) شہرت، نام ونمود، نخوت وغرور، خودرائی اور خودنمائی سے کوسوں دور تھے اور ان روحانی اور اخلاقی بیماریوں سے بچنے کے لئے اکابرین اور علماء ربانیین سے روحانی رشتہ وتعلق رکھتے تھے۔

(۵) دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے قابل فخر ناظم مرشدامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی، اہل تکیہ اور سادات حسنی سے ان کو غیر معمولی لگاؤ تھا، اس کے لئے وہ اہتمام سے ندوہ اور تکیہ کا سفر کرتے تھے۔

(۶) علی گڑھ، اطراف علی گڑھ اور ضلع ہاتھرس کو انہوں نے خاص طور پر عملی اور علمی میدان بنایا تھا کیوں کہ علی گڑھ اور ہاتھرس کے دیہات میں غربت، جہالت اور بدعقیدگی عام تھی اور بہت سے مسلمانوں نے مجبوری کی وجہ سے قادیانیت کو محض مال اور دولت کے لالچ میں قبول کرلیا تھا۔

(۷) وہ موجودہ زمانے کے عام پیشہ ور سماجی خدمت گذار اور رفاہی اداروں سے رسمی طور پر وابستہ افراد کی طرح نہ تھے، جو نام و نمود اور شہرت اور رعب واثر کی خاطر اس میدان میں کود پڑتے ہیں، بلکہ وہ بے لوث اور بے غرض ملی خدمت انجام دینے والے تھے، ان کے پیش نظر مسلمانوں کی فلاح، اصلاح اور تعلیمی ترقی تھی۔

(۸) ڈاکٹر صاحب نیک طبع، شریف النفس اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اپنی فطری سادگی اور سلامتی کے لحاظ سے ایک مثالی انسان تھے۔ دو سال قبل ان کے ساتھ تکیہ کلاں رائے بریلی میں چوبیس گھنٹے گزارنے کے اتفاق ہوا تھا، رات میں عشاء کے بعد کھانے سے اور حضرت کی مجلس سے فارغ ہوئے اور آرام کا وقت ہوا تو شیروانی پہن کر ہی آرام کرنے لگے، میں نے جب ڈاکٹر صاحب مرحوم سے کہا کہ شیروانی اتار لیجئے، تو فرمایا کہ اب شیروانی اتار کر سونے کی عمر ختم ہوگئی۔

(۹) ڈاکٹر صاحب مرحوم انسان تھے، فرشتہ نہیں، بشری تقاضے کی بنیاد پر ان سے بھول چوک اور خطائیں سرزد ہوئی ہوں گی کیوں کہ انسان جہاں خوبیوں کا مرقع ہوتا ہے وہیں خامیاں بھی اس کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور کسی ایک شخصیت میں اس کی خوبیوں اور خامیوں کو مخلوط کر دیجئے تو دنیا اس کی برائیوں میں زیادہ کشش محسوس کرے گی۔ فطرت انسانی کی اس بالیدگی میں بھی ڈاکٹر مرحوم صاحب نے اپنی ذات اور شخصیت کی ایسی تعمیر کی تھی کہ ان کے مخالفین اور ان کے موافقین دونوں ان کے اخلاق وکردار اور ان کی شرافت نفسی کے یکساں قائل تھے۔

(۱۰) مدرسۃ العلوم الاسلامیہ اور علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کی شکل میں انہوں نے ملت کو جو سوغات دی ہے وہ ان کے لئے انشاء اللہ تا قیامت ذخیرۂ آخرت ہے۔ ان کی جدوجہد کی اس خاص نشانی کو اللہ تعالیٰ تادیر قائم رکھے، نظرِ بد سے بچائے، مولانا بلال حسنی ندوی صاحب کی زیر سرپرستی اور ڈاکٹر سعد صدیقی صاحب کی زیر نگرانی اسے دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے ان کے جانشین کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے، اہل خانہ متعلقین عزیز واقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور موحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، آمین، ثم آمین۔

☆☆☆

ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

محمد فرید حبیب ندوی

۶/اکتوبر کی شام، غم اور شامِ ماتم بن کر آئی، موت کے زخمی پنجوں نے ہمارے محسن، علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، علی گڑھ کے بانی جنرل سکریٹری ڈاکٹر غیاث صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کو ہم سے چھین لیا، موت کی بے تاب بجلیوں نے آشیانۂ غیاثی کو سوگوار بنا دیا، یہ موت بھی کیا چیز ہے؟؟ اچھے اچھوں کو رلا دیتی ہے، بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے، جب یہ اپنی کھیتی کاٹنے پر آتی ہے تو اس کے بے رحم ہاتھ نہ بچے کو چھوڑتے ہیں نہ بوڑھے کو، نہ بیمار کو نہ تندرست کو، نہ عالم کو نہ جاہل کو، نہ شاہ کو نہ گدا کو، ہنستے ہنساتے لوگوں کو مجسم تصویرِ غم بنا دیتی ہے، کھلکھلاتے گھرانوں میں صف ماتم بچھا دیتی ہے، محفل سرور کو مجلس غم میں تبدیل کر دیتی ہے، یہی موت تو ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری کروائے، یہی موت تو ہے کہ جس نے وفات رسول پر مدینہ میں ایسا کہرام مچا دیا کہ ہر گھر سے رونے سسکنے اور بلبلانے کے علاوہ کچھ نہ سنائی پڑتا تھا، یہ موت شہر کے شور وفغاں کو قبرستان کی سی خاموشی عطا کر دیتی ہے، سہاگن کو بیوہ، بچوں کو یتیم اور والدین کو بے سہارا بنا دیتی ہے۔ اور پھر اس کے تیر اتنے بہدف ہیں کہ کبھی خطا نہیں کرتے، وہ تو یوں کہو کہ خدا نے صبر و برداشت کی قوت بھی انسان کو دی ہے ورنہ کسے یارا ہے کہ اس درد کی تاب لا سکے، کس میں دم خم ہے کہ اس تکلیف کا سہن کر سکے، لیکن وہ جو اپنوں کی موت کا زخم دیتا ہے وہی دلاسہ بھی دیتا ہے۔ کتنا حکیم ہے وہ کہ اس نے ایسے موقع پر "إنا للہ وإنا إلیہ راجعون" پڑھنے کی حکیمانہ تعلیم دی ہے۔

ہمارے محسن و مربی ڈاکٹر صاحب مرحوم کا سانحۂ ارتحال امت کے لئے ایک بڑا خسارہ ہے۔ شخصیت جیسی اور جتنی عظیم ہوتی ہے اس کی جدائیگی کا غم اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، جانے والا کوئی عام انسان نہیں تھا، ملت کا ایک دھڑکتا دل تھا، اور جب دل ہی کسی سے چھین لیا جائے تو اس کی حالت کا کیا کہنا!! رخصت ہونے والا ایسا ہے کہ رہ رہ کے یاد آئے گا، کوئی یاد نہ بھی کرنا چاہے تو اس کے بس میں کہاں؟ اور کوئی بھلانا بھی چاہے تو کیسے بھلائے، اور ہم منتسبین و متعلقین تو ہزار کوشش کے باوجود فراموش نہیں کر سکتے، یہاں کا ذرہ ذرہ ان کی خوشبو سے مہک رہا ہے، یہاں کے در و دیوار سے آج بھی ان کی رسیلی آواز سنائی دے رہی ہے، یہاں کی فضا میں ان کا روحانی وجود آج بھی نظر آ رہا ہے، بھلا جس زمین پر ہر جگہ ان کے نقش قدم موجود ہیں کیسے اسے دیکھ کر ان کی یاد نہیں آئے گی، ان کا روزمرہ کا مدرسہ آنے کا معمول بھی کیا کوئی بھلا سکتا ہے؟ ان کی شیریں گفتگو کی لذت کو بھی کیا کوئی فراموش کر سکتا ہے؟؟ ان کی اخلاقی عظمت بھی کیا کسی کے ذہن سے محو ہو سکتی ہے؟؟ ان کا وہ پیارا انداز گفتگو، ان کا وہ البیلا طرز کلام ان کی وہ تواضع اور

ملنساری بھلا کوئی چاہے بھی تو کیسے اپنے ذہن ودماغ سے مٹائے !!ان کا اپنے چھوٹوں سے وہ رویہ جو ہم اپنے بڑوں کے ساتھ بھی نہیں برتتے کیا کوئی بھلانے کی شیء ہے؟؟۔آنکھیں اشکبار کہ خادم قوم نہ رہا،قلب مضطرب کہ اس مسیحائے امت کو اب کہاں تلاش کریں،عقل حیران کہ اسلامی اخلاق کے اس کوہ نور کو اب کہاں سے ڈھونڈ نکالا جائے۔مگر کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

سچ پوچھو تو اس بات کا یقینی علم ہونے کے باوجود کہ آپ انتقال کر چکے ہیں اس کا یقین نہیں ہو پا رہا ہے کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں،ایسا لگتا ہے کہ بس وہ مدرسہ آنے ہی والے ہوں گے،ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بس ابھی کہیں چلتے پھرتے نظر پڑ ہی جائیں گے،آخر یقین آئے بھی تو کیسے؟؟ دل کو منایا بھی جائے تو کیوں کر؟؟ من کو بہلایا بھی جائے تو کیا کہہ کر؟؟اور قلب کو تسلی دی بھی جائے تو کس سہارے؟؟ لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کی رخصت دائمی ہے،ان کی جدائیگی تا قیامت ہے،ان کے فراق کا احساس ہی قلب صد پارہ کو پارہ پارہ کئے دے رہا ہے،لیکن ان سے جنت میں ملنے کی امید جینے کا حوصلہ اور سہارا بھی دے رہی ہے۔

ایسا نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی موت کا حادثہ کوئی اچانک پیش آیا ہے، وہ تو ایک سال سے بیمار تھے اور اب تو کئی مہینوں سے بالکل فریش تھے،اور ادھر کئی ہفتوں سے تو ہوش وحواس سے بھی اکثر اوقات غافل رہتے تھے،ہر وقت دھڑکا لگا رہتا اور ہمہ وقت بیم ورجا کی کیفیت رہتی،اس پر بھی صدمہ اتنا سخت تھا کہ قلب پر ایک دھکا سا لگا اور کچھ دیر تک قلب ودماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا رہی،اس لئے کہ انسان جب تک بھی بستر مرگ پر پڑا رہے ایک امید ہوتی ہے،ایک سہارا ہوتا ہے،دیکھنے والا اسے دیکھ کر ایک سکون محسوس کرتا ہے،چراغ گو ٹمٹما رہا ہو مگر اجالا تو ہوتا ہی ہے،لیکن جب صاحب فراش صاحب قبر ہو جاتا ہے،تو یہ ظاہری اور کھوکھلی تسلی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔مگر یہ بے قراری تو ہم زندوں کی ہے،اس جانے والے کا حال تو یہ ہے کہ ؎

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

کیا عجیب زندگی تھی اس کی پیکر اخلاص کی،کیا اونچی شان تھی اس مجسم اخلاق کی،اخلاق اور اخلاص وہ جنس گراں ہے جو اب خال خال ہی ملتی ہے،مگر مرحوم میں یہ دونوں چیزیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں،بڑے متواضع،منکسر المزاج،خلیق اور ملنسار تھے،مروت کے تو گویا پتلے تھے،"بالکل بے آزار انسان تھے،شاید ایذا رسانی اور دل شکنی کی صلاحیت فطری طور پر ان میں تھی ہی نہیں"،چھوٹوں سے بھی اس طرح پیش آتے کہ ہم اپنے بڑوں سے بھی اس طرح پیش نہ آتے ہوں گے،چھوٹوں کے ساتھ کبھی تو ادب واحترام کا وہ معاملہ کرتے کہ وہ خود شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔جب کبھی گفتگو کرتے یا اظہار خیال کرتے تو لگتا کہ ایک ایک جملہ سوز وگداز کے عطر میں بسا نکلتا چلا آ رہا ہے،"از دل خیزد بر دل ریزد" کا صحیح مصداق۔

اور اخلاص کا عالم یہ تھا کہ بیماری کے آخری دنوں میں جبکہ بے ہوشی کی حالت طاری رہتی جب بھی ذرا ہوش آتا تو زبان سے جو کلمہ نکلتا وہ اپنے اعزہ واقرباء اور آل واولاد کے بارے میں بعد میں نکلتا پہلے مدرسے اور ادارے کی حالت دریافت کرتے،مدرسہ کے طلبہ کے بارے میں پوچھتے اسی طرح،اپنے آپ کو ہمیشہ پس پردہ رکھنے کی کوشش کرتے،شہرت ونمود سے قطعی پرہیز کرتے، ادارہ کے تعلق سے فکرمندی کا یہ حال تھا کہ کبھی ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تو کبھی مرغ بسمل کی طرح،اور ہمہ وقت اس کے استحکام اور ترقی کے لئے کوشاں رہتے۔

اس عظیم شخصیت کا جنازہ جب اٹھا ہے تو کیا دردناک منظر تھا، لوگ سوچ رہے تھے کہ ہم ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی ندوی کو دفن کے لئے لے جا رہے ہیں، اور میں محو فکر تھا کہ تم اخلاص و

اخلاق،صبر وتحمل ،ایثار وغمخواری،محبت ومروت،نصرت وتعاون، ملت کے دھڑکتے دل، پریشانوں کی جائے امید محتاجوں کی جائے پناہ،اور نہ جانے،اس ایک کی شکل میں کیا کیا دفن کررہے ہو ؎

کس کو لائے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

ہر آنکھ پرنم تھی اور ہر دل پرغم، بہت سوں کے دماغ شل اور زبانیں گنگ تھیں، ہر ایک کی زبان پر چرچے تھے مرحوم کی نرم مزاجی کے،فردتنی اور عاجزی کے،کرم نوازی اور فیض بخشی کے، خوش اخلاقی اور شریں کلامی کے، کہنے والے کہہ رہے تھے کہ ؎

ایسا کہاں سے لائیں تجھ سا کہیں جسے

تو کیا گیا کہ زمانہ ہی ہم سے روٹھ گیا، یہ دنیا ویران ہوگئی، اس کی تاب کہاں سے لائیں کہ اب اس شہر کی سڑکوں پر تیرے قدم کبھی نہیں پڑیں گے،تو کیا گیا کہ رُت ہی بدل گئی۔ ؎

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ایسے مخلص و جانثار، ایسے صاحب دل، ایسے پیکر ایثار و اخلاق کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا اور جانے والا گویا زبان سے حال سے کہہ رہا تھا ؎

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محنت کا صلہ دینے لگے

مرحوم نے جو کام کیا،انسانیت کی جو خدمت کی اور خاص طور سے اہالیان گڑھ کے لئے وہ جو کام کر گئے انشاءاللہ وہ ان کے لئے صدقہ جاریہ ہے، یہ تو ہماری حرماں نصیبی ہے کہ ہم نے ان کی قدر نہ کی، یہ بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ جانے والے کی اہمیت کا احساس جانے سے پہلے نہیں کیا گیا؟؟ وہ زندہ صورت میں تو اب ہمارے سامنے نہیں مگر ان کے نقش پا اب بھی موجود ہیں۔ساقی نہ رہا مگر جام و پیمانہ اب بھی موجود ہے۔اور حالت کچھ یوں ہے کہ ؎

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

ڈاکٹر صاحبؒ یوں تو بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے،مگر ہم چند ایسی خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے خمیر میں شامل ہوچکی تھیں اور جن میں ہمارے لئے تقلید واتباع کا بڑا سامان ہے:

۱۔ اخلاص وللّٰہیت
۲۔ملت کا درد
۳۔بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کی فکر
۴۔ خدمت کا جذبہ
۵۔ ضیافت کا شوق
۶۔ بزرگوں اور علماء سے بے پناہ عقیدت
۷۔ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی
۸۔ مقصد کے حصول کی دھن اور لگن
۹۔ دوسروں کے مزاج ومذاق کی رعایت
۱۰۔ ظرافت وشگفتہ مزاجی
۱۱۔ غریبوں، مجبوروں اور بے سہاروں کی مدد
۱۲۔ خفیہ طریقے سے بہت سوں کی مالی امداد
۱۳۔ فکر اسلامی یعنی فکر علی میاں سے وابستگی
۱۴۔ مسلکی توسع اور مذہبی رواداری

بہرحال، ڈاکٹر صاحب اپنے حصہ کا کام کرکے رخصت ہوگئے،ملت کے سفینہ کو ساحل پر لگانے کی اپنی سی کوشش کر گئے، اب ہم سب کو ان کے مشن کو آگے بڑھانا ہے،بس افسوس یہی ہوتا ہے کہ اس دور میں زندگی تو سبھی گذارتے ہیں اور گذار کر چلے بھی جاتے ہیں لیکن سب اپنے لئے جیتے ہیں دوسروں کے لئے اور ملت کے لئے جینے والے بہت کم ہوتے ہیں اور جب یہ معدودے افراد بھی ایک ایک کرکے رخصت ہورہے ہیں تو یہ دیکھ کر کلیجے منھ کو آتے ہیں،اور دل پھٹنے پھرتا ہے ؎

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

ہمیں چاہیے کہ ان کے طرز فکر کو عام کریں،ان کے نقش پا کو غنیمت سمجھیں اور ان کے لئے مغفرت وبلندیٔ درجات کی دعا کرتے رہیں۔

☆☆☆

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

محمد عالم ندوی مرادآبادی
مدرسۃ العلوم الإسلامیۃ، علی گڑھ

ہمارے کرم فرما مربی ومحسن جناب ڈاکٹر غیاث صدیقی اگرچہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے، لیکن ان کی یادیں آج بھی ہمارے دلوں میں تازہ ہیں، وہ بھرا ہوا چہرہ، سفید ڈاڑھی، شیروانی میں ملبوس، چہرہ پر مسکراہٹ، ملتے وقت ظریفانہ کلام، آہستہ روی سے مدرسہ میں چلتا پھرتا وجود آپ کے جانے کے بعد دل کو مغموم کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت متین وباوقار، متحمل مزاج، متواضع اور اسلامی اخلاق کا پیکر تھے۔ اللہ نے آپ کو دلِ دردمند اور فکر ارجمند سے نوازا تھا۔ قوم و ملت کے درد کو انہوں نے اپنا درد بنالیا تھا، وہ نونہالان قوم کو، خاص طور سے مدرسہ میں پڑھنے والے طلبۂ کو قوم وملت اور خدا ورسول کی امانت سمجھتے تھے۔ مدرسہ کے طلبہ کے ساتھ ایسے پیش آتے تھے جیسے ایک شفیق باپ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ آتا ہے۔ چونکہ راقم کا زمانہ طالب علمی اسی باغ کے سایہ میں گزا ہے اور گزر رہا ہے جس کو ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے، اس لئے بارہا آپ سے ملاقات کا شرف اور مفید مشورے لینے کا موقع ملا، آج بھی ان کے کچھ کلمات کی نغمگی کانوں میں رس گھول رہی ہے، آپ طلبہ کو دیکھ کر ہمیشہ فرمایا کرتے، بچو! ہم تو چلتے ہیں، یہ کام تمہارا ہے اور تمہیں کرنا ہے۔ ندوہ جانے والے طلبہ سے مخاطب ہوتے تو فرماتے، بچو! ابھی تک تم ایک تالاب میں تھے اب تمہارا سفر ایک بڑے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی جانب ہے، وہاں صرف وہی تیراکی کر سکتا ہے جس نے اس تالاب میں تیراکی کی مشق کی ہوگی۔

طلبہ کے ثقافتی پروگراموں میں بذات خود شریک ہوتے اور ہمیشہ پروگرام میں شریک ہونے کے متمنی رہتے، کامیاب طلبہ سے بے پناہ محبت کرتے، حوصلہ بڑھاتے، اور اپنی جیب خاص سے دلجوئی فرماتے۔ چھوٹے بچوں کو سلام کرتے، اپنے پاس بٹھاتے اور تعلیم کے متعلق چند سوالوں کے بعد فرماتے: بیٹا اگر تم اتنے دنوں میں حفظ مکمل کرلو تو ہم تم کو یہ اور یہ انعام دیں گے۔

طلبہ کو اکثر عربی، ہندی، انگلش اور اردو میں لکھنے کے لئے ابھارتے، اس کے لئے مدرسہ میں جداریہ پرچوں میں مضامین لکھنے کی ترغیب دیتے۔

جس وقت راقم نے زمانہ طالبعلمی میں ایک مراسلہ روزنامہ کے لئے لکھا، اتفاق سے وہ دو چار روز کے بعد شائع ہوا۔ اس دوران راقم گھر پر گیا ہوا تھا، جب ڈاکٹر صاحب کی نظر اس مراسلہ پر پڑی تو فون کر کے حوصلہ افزائی فرمائی۔

الغرض ہمارے ڈاکٹر صاحب کو اللہ رب العزت نے بے پناہ خوبیوں سے نوازا تھا، آپ جانے کو تو چلے گئے اور ہر شخص کو جانا ہے لیکن اس گلشن کو ویرانہ کر گئے۔

آپ اپنی آخری قیام گاہ میں آرام فرما ہیں لیکن اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ اس چمن کے جھونکے آپ کی روح کو فرحت و انبساط بخش رہے ہوں گے۔

آپ کی بیماری اور پھر سانحہ ارتحال نے ہر اس شخص کے دل پر اثر کیا ہے جس نے بھی آپ سے ایک ملاقات کی ہے، جس وقت آپ کا جنازہ گھر سے مدرسہ کی جانب لایا جارہا تھا..... (بقیہ ص ۵۰ پر)

ندوۃ العلماء جانے والے طلبہ سے ڈاکٹر غیاث صاحبؒ کا ایک خطاب

نوٹ: یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وہ تقریر ہے جو آپ نے گذشتہ سال مدرسہ سے فارغ ہوکر ندوۃ العلماء جانے والے طلبہ سے الوداعی پروگرام میں فرمائی، اس کے ایک ایک لفظ سے ڈاکٹر صاحب کا خلوص اور درد ٹپک رہا ہے، مرحوم کے ایک عزیز اور مدرسہ کے طالب علم حسن عمار نے اسے تحریری شکل میں منتقل کیا، ادارہ اسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ (ادارہ)

محترم اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ! ادھر کافی عرصہ سے میں مختلف بیماریوں کا شکار ہوگیا، اپنے محسنین وطلبہ کی دعاؤں سے اللہ کا شکر واحسان ہے کہ آج میں خود آپ کے سامنے آکر بیٹھا ہوں، طلبہ کی باتیں سنیں بہت اچھی لگیں، الحمدللہ طلبہ کو جو تاثرات دینے چاہیے تھے بالکل صحیح دئے۔

طلبہ کو جس شدت سے ہم دعوت دیتے ہیں، بلاتے ہیں، اور ہم ان کی ضروریات زندگی بھی پوری نہیں کر پاتے لیکن مستقل کوشاں رہتے ہیں، پھر بھی بہت سی کمیاں رہ جاتی ہیں، قیام میں، طعام میں، اور سہولیات میں، لیکن اللہ جل شانہ کی طرف سے خاص کرم اور خاص احسان یہ ہے کہ اللہ نے اپنے رحم وکرم سے ایسے اساتذہ بھیج دئے، جن کے اندر استعداد اور صلاحیت ہے، ہم شکر گزار ہیں اساتذہ کے جو اس سے اچھی جگہ جا سکتے تھے، زندگی کا معیار بلند کر سکتے تھے لیکن وہ یہاں بہت تھوڑے پر اپنا وقت دیتے ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی دیکھ ریکھ میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں، بلکہ ہم سے آگے چل رہے ہیں اور ہم بہت پیچھے چل رہے ہیں یہ محض اللہ کا کرم، اس کا فضل ہے، ہم اپنی طرف سے تو محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر کمیاں ہیں اور ہم اساتذہ اور طلبہ دونوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتے لیکن طلبہ کو جو محنت کرنی چاہیے مختلف موقعوں پر اندازہ ہوتا ہے کہ کرتے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ زندگی میں کچھ کریں گے، یہ ایک چھوٹا سا ادارہ ہے اور ادارے بہت بڑے بڑے ہیں، آپ جہاں جا رہے ہیں اس وقت وہ بھی اس کے مقابلہ میں سمندر کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں کے اساتذہ، وہاں کے منتظمین، وہاں کے تربیت کرنے والے اساتذہ اور منتظمین سب آپ کو اس حیثیت سے دیکھیں گے کہ آپ علی گڑھ سے آئے ہیں، آپ کی صلاحیت و استعداد دیکھیں گے، آپ کی تربیت دیکھیں گے، آپ کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا اور آپ کا Character، ایک ایک چیز پر سب کی نظر ہوگی، آپ انشاء اللہ اس ادارے کی مقبولیت و شہرت کا ذریعہ بنیں گے، بس اتنی کوشش کرنا کہ آپ پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کہ آپ علی گڑھ سے ہیں اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔

اور میرے عزیزو! جو باتیں کہنی تھیں طارق صاحب نے کہہ دیں، بہت سخت ضرورت ہے آپ کی اس دور میں، اسلام کا داعی بننے کی، اور صرف رسم اذاں کی نہیں روح بلالی کی بھی ضرورت ہے، رسم اذاں کی بھی ضرورت ہے، اس لئے کہ بغیر پرکشش آواز کے بغیر پرکشش کلام کے، بغیر پرکشش کتاب کے تحریر کے آپ کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ہمارے محترم مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ابھی سے طے کر کے جائیں، اختصاص کس میں کریں گے، ابھی سے جس طرف ذہن ہے ادھر کوشش کریں۔ میرے عزیزو! محنت کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جس وقت آنکھ کھلے وہی سویرا ہے، ابھی سے نیت کریں انشاء اللہ اپنے کو اس قابل بنا کر چلیں گے کہ زمانہ آپ کی طرف دوڑ کر آئے اور آپ کی ضرورت کو محسوس کرے، آپ کی قیادت کو تسلیم کرے، آپ کے پیچھے چلنے کو آمادہ ہو، اور یہ اسی وقت ہوگا جب آپ کے اندر صلاحیت ہوگی، استعداد ہوگی، اختصاص ہوگا، روح بلالی ہوگی، میں تقریر وغیرہ پہلے سے نہیں کر پاتا تھا ادھر دوبارہ Surgary کے بعد جو تھا وہ بھی بس، تمام بچوں سے دعاء کی درخواست ہے، وقت کا کچھ پتہ نہیں، کس وقت کیا ہوجائے، امراض دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، اللہ شانہ کا کرم ہے، مرض بھی وہی دیتے ہیں شفا بھی وہی دیتے ہیں، بس دعا کرتے رہنا، کام ابھی بہت ہے۔ ہم تو کام کی بنیاد بھی نہ رکھ سکے۔ اب آپ لوگوں کے حوالہ ہے۔ حضرت مولانا (علی میاں ندویؒ) کی فکر کو، ان کے ذہن، ان کے انداز کو، جو تڑپ اور اللہ اور اس کے رسول سے انہیں جو تعلق تھا اس کو پڑھنا سمجھنا، اپنانے کی کوشش کرنا، ہم کچھ نہیں کر پائے ڈھول پیٹتے رہے، بس اپنے اس ادارہ پر کبھی فراغت کے بعد یا اس سے پہلے کام کا میدان ملے تو ٹوٹنے کی نوبت نہ آنے دینا۔ اور فی الحال اس وقت یہ سب آپ حضرات کے حوالہ ہے، دعاء کریں کہ اللہ اس کو شاد رکھے، آباد رکھے، بالکل صحیح ہے کہ یہ ابھی صرف یہ ایک پودا ہے، تناور بھی نہیں، پھل وغیرہ تو ابھی بہت دور ہیں۔ آپ حضرات ہی اس کے پھل ہیں، آپ ہی اس کے برگ وبار ہیں، اور آپ ہی اس کا مستقبل ہیں، دعاء کریں کہ اللہ ہر فتنہ اور شر سے اس کی حفاظت فرمائے، آمین۔

(پیش کش: حسن عمار ، عالیہ ثانیہ)

☆☆☆

مرحوم کی یادوں سے

خاص تحریر

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل- بابری سے دادری تک

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

۱۴-۱۵ کروڑ کی مسلم آبادی اس ملک میں رہتی، ہے سرکاری اعداد وشمار کے مطابق مسلمانوں کی آبادی ۱۳۸ ملین ہے، یعنی ۱۴ کروڑ سے کم، غیر سرکاری اندازہ کی مطابق مسلمان ۱۷ کروڑ کے قریب ہیں۔ دنیا میں انڈونیشیا کے بعد یہ سب سے بڑی مسلم آبادی ہے، قابل لحاظ عددی قوت کے باوجود یہاں مسلمان تعلیم اور اقتصادیات اور ملازمتوں میں اورسکیوریٹی اور تحفظ کے شعبوں میں حاشیہ پر ہیں، گوپال سنگھ کمیشن رپورٹ ۱۹۸۰ کے مطابق سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم ہے، پرائیویٹ سکٹر میں بھی ان کا کوئی پرسان حال نہیں، اس سکٹر میں حکومت کی سفارش پر کچھ مراعات ملی ہیں تو صرف ایس سی/ ایس ٹی والوں کو ملی ہیں، سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق معیشت اور تعلیم میں مسلمانوں کا حصہ صفر کے قریب ہے۔ وہ ترقی کے تمام شعبوں میں بے حد پسماندہ ہیں، ان کی حالت شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب سے زیادہ گئی گذری ہے۔ کبھی کبھی ان کے لئے مراعات کا اعلان کیا جاتا ہے، لیکن یہ سہولیات اور مراعات انہیں نہیں دی جاتی ہیں، پھر اسی کے ساتھ ان کے ساتھ زیادتیاں ہوتی ہیں، جھوٹا الزام لگا کر انہیں قتل بھی کر دیا جاتا ہے جیسا کہ دادری میں ہوا، فسادات میں ان کا قتل عام ہوتا ہے، ان کو تحفظ فراہم کرنے میں حکومت کا رکارڈ مایوس کن ہے، سکیوریٹی فورسز میں مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کے برابر ہے، انہیں ہر طرح کی زیاتیوں کا شکار بنایا جاتا ہے، نسل کشی اور نسلی تطہیر کے عذاب سے انہیں گذرنا ہوتا ہے، جھوٹے الزمات میں انہیں پوٹا اور ٹاڈا کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے، ان کا انکاونٹر کیا جاتا ہے یا کئی کئی سال کے لئے انہیں سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے، مدرسوں کو شبہات کے دائرہ میں لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ دینی جماعتوں کے کاموں میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے، مسلمانوں کو غیر ملکی اور حملہ آور اور غدار قرار دے کی ان کی شبیہ خراب کی جاتی ہے، گھر واپسی کے نام پر ان کا مذہب بدلنے کی کوشش ہوتی ہے، اسکولوں میں سوریہ نمنسکار اور یوگا اور گیتا کا پاٹھ وغیرہ کے ذریعہ مسلم بچوں پر ہندو تہذیب کو مسلط کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ بابری مسجد کی جگہ پر مورتیاں رکھ دی گئی ہیں جن کی پوجا ہوتی ہے اور وہاں رام مندر بنانے کا منصوبہ ہے، مسلمانوں کی اکثریت کی زبان اردو کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے بڑی کمپنیوں کے ڈائرکٹر اور اعلی عہد ہداروں اور سینیر اگزیکیوٹیو کی فہرست اٹھا کر دیکھ لیجئے مسلمان ایک فی صدی بھی نہیں ملیں گے، اس سکٹر میں پسماندہ طبقات کے لئے حکومت نے خصوصی رعایت برتنے کی سفارش کی تھی لیکن اس کا فائدہ مسلمانوں کو نہیں بلکہ دلتوں کو ملا، تجارت، تعلیم اور ملازمت ہر جگہ مسلمانوں کی نمائندگی بے حد کم ہے، ان کی حالت قابل رحم ہے، تعلیمی اداروں میں ایس سی/ایس ٹی کے لئے رزرویشن ہے، اس کا فائدہ ان کو پہونچا ہے، وہ ملازمتوں میں بھی نظر آتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے لئے نہ تعلیمی اداروں میں رزرویشن ہے اور نہ نوکریوں میں ان کے لئے کوٹا ہے، نہ

جاب مارکٹ میں ان کی کوئی جگہ ہے، اس لئے وہ اچھی ملازمتوں میں اعلیٰ منصب پر آسانی کے ساتھ نظر نہیں آتے ہیں ان کا وجود غیر موجود اور معشوق کی موہوم کمر کی مانند معدوم ہوتا جارہا ہے" ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" آئی ایف ایس اور آئی پی ایس، ریلوے اور محکمہ صحت، اور دیگر محکموں میں ان کا فی صد ۱۴ اور ۱۵ فی صد ہونا چاہئے تھا لیکن دو تین فی صد ہے، جارحانہ قوم پرستی کی یہ" نامہربانیاں" اس قوم کے ساتھ روا رکھی گئی ہیں جس نے کئی سو سال تک اس ملک میں عزت کے ساتھ حکومت کی ہے اور غیر مسلموں کے ساتھ بحیثیت مجموعی فراخ دلی اور رواداری کا معاملہ کیا ہے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی، مسلمانوں کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے اس چمن کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ اہل قلم نے اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی ہیں، لیکن یہاں پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا معاملہ کیا جارہا ہے، اس سے آگے بڑھ کر ہندتوا کے لیڈر مستقبل میں "مسلم مکت بھارت" بنانے کا اعلان کر چکے ہیں۔ پہلے ساورکر، گولوالکر اور ہیڈگیوار کے مسلم دشمنی پر مبنی نظریات انفرادی نظریات تھے، زیادہ سے زیادہ ایک بہت چھوٹے فرقہ سے اس کی نمائندگی ہوتی تھی، لیکن اب یہی باد سموم ہے جو وطن کے چمن میں چل رہی ہے اور پھولوں کو مرجھا دے رہی ہے۔ نئی حکومت کا نعرہ "سب کا ساتھ سب کا وکاس" ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا ہے۔ اور نہ اس پر عمل کرنے کا پرخلوص ارادہ ہے۔

یہاں مسائل کی شناخت کے طور پر ان باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، بحری سفر میں سمت سفر تلاش کرنے سے پہلے پوزیشن فکسنگ ضروری ہوتی ہے، اس لئے آگے کا لائحہ عمل طے کرنے سے پہلے موجودہ حالت کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس وقت یہ سنگین صورت حال ہے جس سے نکلنے کا راستہ ہمیں ڈھونڈھنا ہے، آج مسلمانوں کے مسائل پر غور کرنے والوں کو کسی متعین سوچ تک پہونچنے کی ضرورت ہے اور پھر اس سوچ کو لائحہ عمل میں ڈھالنے کی ضرورت ہے اور پھر لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ بہت قابل قدر ہیں وہ لوگ جنہوں نے ملت کے غم کو اپنا غم بنایا ہے، وہ رات دن اس کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں، ہم یہاں مسلم قیادت کو مطعون کرنا نہیں چاہتے، مسلم قیادت پر لاف زنی خطرناک رجحان ہے، آزادی کے بعد اور تقسیم وطن کے بعد کے جا فکسل حالات میں مسلم قیادت نے بہت سے قابل تعریف کام کئے ہیں، اس کا اعتراف نہ کرنا احسان ناشناسی و ناشکری ہے، اور مسلم قیادت کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنانا زبان درازی ہے، مسلمانوں کی زوال پذیر معیشت اور اقتصادی بدحالی کے باوجود یہی مسلم قیادت تھی جس نے برادران وطن تک حق کا پیغام پہنچانے کے لئے ملک کی تمام علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجموں کا اہتمام کیا، ہندی اور مقامی زبانوں میں سیرت اور اسلام کے تعارف کی کتابیں شائع کیں، قریہ بہ قریہ، کو بہ کو دینی تعلیم کے ادارے قائم کئے، ایک بڑی ریاست میں گاؤں گاؤں بچوں کو دینی تعلیم دینے اور اردو زبان سکھانے کے لئے مکتب کا جال بچھا دیا گیا، مسلمانوں کو اچھا مسلمان بنانے اور ان کے اندر ایمانی روح پھونکنے کیلئے اور ان کا رشتہ نماز سے اور مسجدوں سے جوڑنے کے لئے شہر بہ شہر اور گاؤں گاؤں تبلیغ کی جماعتیں پہونچیں، جن کی کوششوں سے لاکھوں لوگ نمازی اور ہزاروں تہجد گذار ہوئے، ایسے تھنک ٹینک سامنے آئے جنہوں نے مسلم ایشوز پر مسلمانوں کے جدید اور قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کو اور صاف دل برادران وطن کو بھی جمع کیا اور مسلمانوں کے امپاورمنٹ پر تحقیقی کتابیں بھی پیش کیں اور مسلم ایشوز پر سمینار بھی کئے، آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مسلم قیادت کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع بھی ہوئے اور انہوں نے ملک کے دورے بھی کئے، غیر مسلموں کے انسانی ضمیر کو خطاب کرنے کے لئے انسانیت کے نام پر بھی کچھ دردمند علماء کھڑے ہوئے اور انہوں نے برادران وطن کو خطاب کیا۔ مسلم پرسنل لا پر خطرات کے بادل منڈلائے تو مسلم قیادت نے زبردست اتحاد کا ثبوت دیا، مقابلہ کے امتحانات میں مسلم نوجوانوں کی تربیت کے لئے

بھی ادارے قائم ہوئے، جنوبی ہندوستان میں میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج بھی مسلمانوں نے قائم کئے، الغرض یہ کہنا درست نہیں کہ ہندوستان میں مسلم قیادت نے کوئی کام نہیں کیا، اس طرح کا الزام غلط ہے اور یہ الزام لگانے کے لئے بے خبری، عقل کے ساتھ بے مہری، دل کی بہت بڑی مقدار درکار ہے۔ لیکن آزادی کے بعد سے بتدریج حالات اتنے سخت اور سنگین ہو گئے ہیں کہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال پہلے سے جو کوششیں کی گئیں ہیں اور کی جارہی ہیں وہ اب ناکافی ثابت ہورہی ہیں، اب نئے حالات میں نئی تدبیریں اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

''ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر''

ہمیں پھر سے اپنے کاموں کا جائزہ لینا ہے اور نئے عزم اور نئی قوت کے ساتھ عمل کی شاہ راہ ڈھونڈنی ہے اور اس شاہراہ پر صبر واستقامت کے ساتھ چلنا ہے''وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر'' مسلمانوں کے تمام مسائل کو مختصر لفظوں میں Nut shell میں بیان کیا جائے تو ہم اسطرح کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو اکثریت کا ایک طبقہ ان کا جائز دستوری اور جمہوری حق دینے کیلئے تیار نہیں ہے، یہ طبقہ پہلے مختصر تھا اب بتدریج بڑا ہو گیا ہے اور وہ سیاہ وسفید کا مالک بھی بنتا جارہا ہے اور اب اقتدار کی کنجی بھی اس کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ اب ہم مسائل کے حل کے بارے میں سوچیں اور قرآن سے رہنمائی حاصل کریں تو درج ذیل باتوں پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔

۱۔ ہمیں اس آیت پر غور کرنا ہوگا لاتستوی الحسنہ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی أحسن فاذا الذی بینك وبینه عداوۃ کأنه ولی حمیم وما یلقاھا إلا الذین صبروا ومایلقاھاء الا ذو حظ عظیم (نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی، بدی کو نیکی کی بہترین شکل سے دور کرو، پھر تم دیکھو گے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان تمہاری دشمنی ہے وہ تمہارا گہرا دوست بن گیا، لیکن یہ خوبی نہیں ملتی ہے مگر انہیں جو صبر اختیار کرتے ہیں اور انہیں جو بڑی قسمت والے ہیں) قرآن نے حل یہ بتایا ہے کہ برائی کو اعلی درجہ کی نیکی سے ہٹاؤ یعنی نیکی بھی معمولی درجہ کی نہیں بلکہ بلند ترین اور بہترین ہونی چاہئے یعنی دشمن کے ساتھ ایسا سلوک ہونا چاہئے جو دل کو جیت لے، اگر ایسا سلوک کیا جائے گا تو جو تمہارا دشمن تھا وہ تمہارا دوست بن جائے گا، قرآن کہتا ہے کہ اس کے لئے اعلی درجہ کا صبر وتحمل درکار ہے اور یہ بڑی بخت آوری کی بات ہے۔ مسلمانوں کو اعلی درجہ کی ایمانی اور اخلاقی قوت درکار ہے، اللہ سے تعلق کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، دشمن کے ساتھ حسن سلوک کے لئے اس کے ساتھ تعلقات استوار کرنا ضروری ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی رہتے ہوں غیر مسلم پڑوسیوں سے، برادران وطن سے ان کے روابط استوار ہونے چاہئیں اور ان کے حسن اخلاق کا اچھا نقش غیر مسلموں کے دلوں پر قائم ہونا چاہیے، غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا مطلب مداہنت نہیں ہے یعنی ہمیں دین وایمان کے کسی جزء سے دستبردار ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ظلم وستم کی دلدوز تاریخ کے باوجود ملک کے خمیر میں شرافت اور روحانیت کا جزء بھی موجود ہے خاکستر میں دبی ہوئی اس چنگاری کو شرارہ بنانے کی ضرورت ہے اس کے لئے ہمیں متصوفانہ نرمی، فراخ دلی، وسعت نظری اور توسع اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی، خدمت خلق اور خدمت انسانیت کو اپنا شعار بنانا ہوگا، اور ضرورت پیش آجائے تو عارضی طور پر مستقبل کے بڑے فائدہ کے لئے اور حقوق کی بازیابی کے لئے اپنے کسی جائز حق سے بھی دست برداری اختیار کی جاسکتی ہے۔ یہ حلال کو حرام کرنا نہیں ہے بلکہ حکمت عملی ہے، اور اعتماد کی بحالی اور خلیج کو پاٹنے کی ایک کوشش ہے، اس کی مثال ہمیں یہاں مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی ملتی ہے، بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو جو نصیحت کی تھی وہ رکارڈ میں ہے، اس نے کہا تھا کہ'' بیٹے یہ ملک ہندوستان مختلف مذہبوں کا گہوارہ ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں یہاں کی بادشاہت عطا کی ہے، ہمیں اپنے دل سے تمام امتیازات کو نکال دینا چاہئے، اور ہر فرقہ کے ساتھ اس کی

روایات کے مطابق انصاف کرنا چاہئے، انتظامی معاملات میں لوگوں کا دل جیتنے کے لئے گائے کی قربانی سے اجتناب کرو، اپنی حکومت کی سرحدوں میں عبادت گاہوں اور مندروں کو نقصان نہیں پہونچانا، حکومت کا ایسا ڈھنگ نکالو کہ مملکت میں رہنے والے تمام لوگ بادشاہ سے خوش ہوں اور بادشاہ اپنی عوام سے خوش ہو، اسلام عمدہ اعمال سے فروغ پاسکتا ہے خوف سے نہیں (خوف دلا کر نہیں)'' یہ نصیحت جو بابر نے کی تھی، توسع ورواداری اور حکمت عملی ہے۔ جس کی جھلک ہمیں صلح حدیبیہ میں نظر آسکتی ہے یعنی مستقبل کے بڑے فائدہ کے لئے بعض حقوق میں تنازل اختیار کرنا، ملک میں امن وآمان کے لئے اور اعتماد اور اتحاد کی فضا پیدا کرنے کے لئے جائز حق سے تنازل اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ اس ملک میں مسلسل کشمکش کی فضا مسلمانوں کے مفاد میں نہیں ہے اور دعوت کے کام کے لئے تو یہ فضا سم قاتل ہے۔ مسائل کا حل ڈھونڈھنے میں ہمارے پیش نظر یہ حقیقت بھی ہونی چاہئے کہ اس ملک میں پرامن بقائے باہم اور مذاہب کے یکساں احترام کی مضبوط روایت بھی موجود رہی ہے، اس مدفون یا کمزور روایت کو سہارا دے کر مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں غور کرنا ہوگا کہ ہم اس روایت کو کیسے مضبوط کریں۔

۲۔ ہمیں اس حقیت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ظلم اور ناانصافی اور استحصال کا شکار یہاں دوسری اقلیتیں بھی ہیں اور دلت گروپ، او بی سی، ایس سی، ایس ٹی یعنی پسماندہ طبقے بھی یہاں انصاف سے محروم ہیں اور وہ اعلی ذات کے مقابلہ میں بہت بڑی اکثریت میں ہیں، ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ہم ان سے تعلقات کیسے استوار کریں اور کیسے ان کی مدد کریں، اور کیسے اپنے لئے ان کی مدد حاصل کریں اور ہمیں اگر خود کو مستحکم کرنا ہے تو آگے بڑھ کر ہمیں پیش قدمی کرنی ہوگی اور سماج کے محروم طبقہ کو گلے سے لگانا ہوگا، ہمیں ان کی مدد کرنی ہوگی، کچھ لوگوں کو اس کام کے لئے فارغ ہونا ہوگا۔

۳۔ غیر مسلموں سے اور خاص طور پر پسماندہ طبقات سے قریبی تعلقات اس لئے بھی ضروری ہے کہ مسلمان امت دعوت ہیں اور دعوت کے لئے کامیابی کے امکانات سماج کے محروم طبقہ میں زیادہ ہیں۔ ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا ہوگا کہ مسلمانوں اور دلتوں کے درمیان قربت کیسے ہو، تعلقات کیسے استوار ہوں، میل جول کیسے بڑھے۔ اور ان کو اسلام سے کیسے قریب کیا جائے۔ ہمارے سامنے اسپین کی تاریخ ہے جہاں مسلمانوں نے سات سو اسی (۷۸۰) سال حکومت کی تھی، جہاں مسلمانوں نے مسجد قرطبہ جیسی عالی شان مسجد تعمیر کی تھی، جہاں مسلمانوں نے مدینۃ الزہراء جیسا شہر آباد کیا تھا، جس کو دیکھ کر سیاح آج بھی دنگ رہ جاتے ہیں، جہاں بڑے بڑے علماء، فن طب کے ماہرین اور سائنس داں پیدا ہوئے، جہاں بڑے بڑے مصنفین اور ادباء نے اپنے اپنے میدان میں پیشوائی کی، وہاں اولیاء بھی پیدا ہوئے، لیکن علوم وفنون میں پیشوائی کام نہیں آئی، زہد وتصوف بھی کام نہیں آیا۔ مسلمان وہاں اکثریت میں کبھی نہیں رہے، مسلمانوں نے وہاں اکثریت کو یعنی عیسائیوں کو اسلام کی دعوت نہیں دی، اس لئے مسلمانوں کو ایک دن ملک کو چھوڑ دینا پڑا۔ اللہ تعالی کو نہ اسپین کی پرواہ ہے نہ مسجد قرطبہ کی، نہ دہلی کی جامع مسجد کی پرواہ ہے، نہ خانقاہوں کی پرواہ ہے، اللہ کے بندوں کو ایمان کی دعوت دینا اصل کام ہے۔ پہلے خانقاہوں کے ذریعہ ہندوستان میں دعوت اور تبلیغ کا کام ہوتا تھا اب خانقاہیں درگاہیں بن گئی ہیں، اس ملک کو اسپین جیسے انجام سے بچانا ہے تو غیر مسلموں سے تعلقات اور دعوت کے کام کو اولیت دینی ہوگی، ہندوازم کے مطالعہ کا شعبہ مدارس اور دوسرے اداروں میں قائم کرنا ہوگا اور ایسے علماء تیار کرنے ہوں گے جو ہندوؤں سے بھی زیادہ ان کے مذہب کو جانتے ہوں اور ہندوؤں کی زبان میں ڈائلاگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

۴۔ ہندوستان میں اور اس جدید عہد میں مسلمانوں کو اپنی جگہ بنانے کے لئے ایک ہمہ گیر تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے، یہ وہ زینہ ہے جس

کے ذریعہ مسلمان ترقی کی بلندی تک پہونچ سکتے ہیں، ہندوستان میں تعلیم اور معیشت میں مسلمانوں کی حصہ داری تین فی صد سے بھی کم ہے جب کہ آبادی سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ۱۴ فی صد کے قریب ہے، شمالی ہند کی تین ریاستوں اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں مسلمان ملک کی پوری مسلم آبادی کا نصف ہیں لیکن معیشت اور تعلیم میں ان کا حصہ صفر کے قریب ہے، محرومیوں کا بنیادی سبب تعلیم اور معیشت میں پسماندگی ہے جسے دور کرنے کی اشد ضرورت ہے، دستور میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ اقلیتیں اپنے تعلیمی ادارے قائم کرسکتی ہیں اور انہیں چلاسکتی ہیں، دستور میں دفعہ ۴۶ کے رہنما اصول میں کہا گیا ہے کہ حکومت عوام کے کمزور طبقات کے تعلیمی اور معاشی مفادات کو فروغ دے گی، عیسائیوں نے بے شمار تعلیمی ادارے قائم کئے، مسلمانوں کو رکاوٹ کے باوجود صبر واستقلال کے ساتھ اس میدان میں کام کرنا ہے۔ مسلم قیادتوں کو اندھیرے کا شکوہ کرنے کی بجائے اپنے حصہ کی شمع جلانے کی کوشش کرنی چاہئے، مسلمانوں کی جتنی مرکزی اور ریاستی قیادتیں ہیں انہیں اچھے معیار کے ایسے اسکول قائم کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے جن میں مذہبی، اخلاقی اور اردو کی تعلیم کا نظم ہو۔ اس وقت اچھے معیار کے عصری اسکولوں کے قائم کرنے کی شدید ملی ضرورت ہے اور یہ کارثواب بھی ہے۔

۴۔ اس ملک میں ہماری ایک اہم ضرورت باہمی اتحاد و اتفاق ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی تنظیم ایک سے زیادہ تنظیموں میں بٹ جاتی ہے اور باہمی الزام اور دشنام اور اتہام کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ بعض دردمند دل اتحاد کو قائم کرنے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہوئے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے اقرار نامہ اور عہد نامہ بھی تیار کیا ہے۔ یہ بات کبھی ذہن سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ اتحاد کا حکم قرآن کا منصوص حکم ہے اور نص قطعی سے ثابت ہے، لیکن یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اتحاد لفظ اتحاد کو دہراتے رہنے سے نہیں پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہوتا ہے اسی طرح سے اتحاد بھی کچھ مرکب صفات کا نام ہے، اتحاد کچھ اخلاقی خصوصیات کا حاصل ضرب ہے۔ اگر قوم میں یہ صفات پیدا ہوجائیں گی تو اتحاد خود بخود پیدا ہوجائے گا۔ اور یہ صفات ہیں دوسروں کا احترام، دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینا، عیوب کی پردہ پوشی اور غیبت سے مکمل پرہیز، نرمی اور خوش اخلاقی، دوسروں کے ساتھ تعاون۔ امت میں ان صفات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ صفات نہیں پیدا ہوں گی تو اتحاد نہیں پیدا ہوگا اور اگر یہ صفات پیدا ہوجائیں گی تو مسلم معاشرہ گلستان محبت میں بدل جائے گا اور خیرخواہی اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہوجائے گی۔ ان اخلاقی صفات کو پیدا کرنے کیلئے جمعہ کے اردو خطبات کو وسیلہ بنانا چاہئے۔

۵۔ مسلمانوں کے بہت سے ضروری کاموں میں ایک ضروری کام انتخابی اسٹریٹیجی تیار کرنا بھی ہے تاکہ مسلمانوں کے ووٹ تقسیم نہ ہوں اور مسلم دشمن فرقہ پرست عناصر غالب نہ آسکیں، اس کے لئے بھی مختلف قیادتوں کا باہمی اعتماد اور اتحاد ضروری ہے، مسلمانوں کے بہت سے ضروری کاموں میں تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لائحہ عمل تیار کرنے پر فوری توجہ کی ضرورت ہے، اس ملک میں مسلمانوں کے کام ''ملٹی لائین ہائی وے'' Multiline High Way کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں بیک وقت کئی محاذوں پر کام کرنا ہے، اس کے لئے الگ الگ صلاحیتوں، الگ جماعتوں، تنظیموں اور این جی اوز کی ضرورت ہے، یہ ساری تنظیمیں ایک دوسرے کا تکملہ ہوں گی اور ان کے درمیان افتراق اور اختلاف نقصان دہ ہوگا، ہمیں کبھی آپس میں باہمی مشاورت بھی کرنی ہوگی اور مل کر کے بیٹھنا بھی ہوگا، اس کے لئے اس میدان کے ماہرین کی مشاورت اور خود احتسابی ضروری ہے۔ باہمی مشاورت سے اور خود احتسابی سے بہت سے کاموں کا نیا میدان سامنے آئے گا، قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جو ملت کے غم کو اپنا غم بناتے ہیں اور ملت کے مسائل پر غور کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

☆☆☆

آخری صفحہ

ایک اور ستارہ روپوش ہوا

م-ق-ن

راقم السطور عیدالاضحیٰ کی تعطیل کے بعد ۶/اکتوبر ۲۰۱۵ء کو مدرسہ نورالاسلام کنڈہ حاضر ہوا، دوپہر کو عزیز گرامی قدر فرید حبیب ندوی سلمہ سے بذریعہ فون رابطہ کیا کہ ڈاکٹر غیاث صدیقی ندوی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ موت وزیست کے درمیان حیات مستعار کے آخری دن گذار رہے ہیں، بس چل چلاؤ کا وقت ہے، اسی رات عزیز گرامی محمد سلمان دہلوی نے بتایا کہ ابھی ابھی عشاء کی نماز کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب کے انتقال اور ان کے لئے دعاء مغفرت کا اعلان کیا گیا۔

اس حادثہ کا اتنا اثر ہوا کہ خاکسار اپنے اندر اتنی ہمت اور طاقت نہ پاسکا کہ فوری طور پر مدرسۃ العلوم الاسلامیہ کے مہتمم اور اپنے انتہائی عزیز اور مخلص دوست جناب ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی صاحب سے تعزیت کرسکوں۔

تجہیز وتکفین اور تدفین کی ساری تفصیلات اور پل پل کی خبریں عزیزی فرید حبیب ندوی کے ذریعہ معلوم کرتا رہا، ڈاکٹر غیاث صاحب سے خاکسار کا تعلق پانچ سال سے رہا، ویسے ان کی شخصیت اور ذات سے تعلق ۱۹۹۸ء سے رہا، جب میں علی گڑھ پہلی بار گیا تھا، اور استاذ محترم داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنیؒ کے ساتھ ان کے گھر پر عشائیہ (رات کے کھانے) پر مدعو تھا، اس وقت ڈاکٹر صاحب کی حسن صورت اور حسن سیرت نیز ان کی خاکساری وتواضع اور دین کے لئے ان کے درد اور تڑپ کا احقر نے جو مشاہدہ کیا، اس کا گہرا اثر پڑا، ڈاکٹر صاحب نے اس دعوت کو دینی دعوت میں بدل دیا تھا، کھانے میں بہت سارے پروفیسران اور عمائدین شہر کو بھی ڈاکٹر صاحب نے مدعو کیا تھا، عشائیہ سے پہلے حضرت مولانا عبداللہ حسنیؒ نے ''حالات حاضرہ اور خواص کی ذمہ داریاں'' کے عنوان پر بہت ہی مفید گفتگو فرمائی، اور حاضرین کے سوالات کے تشفی بخش جوابات دیے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، کارنامے، اخلاق اور ان کے امتیازی اوصاف وخصوصیات پر مستقل ایک علاحدہ مضمون ندائے اعتدال کے انہی صفحات میں تحریر کررہا ہوں۔

اس آخری صفحہ کالم کے تحت میں ان کے فرزندوں، اہل وعیال اور متعلقین نیز ان کے محبوب جن کی عزت وہ ناز برداری کی حد تک کرتے تھے، میری مراد ڈاکٹر طارق ایوبی ہیں، ان کی تعزیت کے لئے ایک اقتباس اس پیغام کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی موت بلکہ ہر مومن کی موت ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک دوسری حیات کی ابتدا ہے:

''حکایتِ ہستی کے دو ہی اہم واقعات ہیں، پیدائش اور موت، موت وحیات کا یہ فلسفہ کائنات کے دیگر اسرار کی طرح اب تک صیغہ راز میں عقدۂ لاینحل ہے ۔

فلسفی سرّ حقیقت نہ توانست کشود
گشت راز دیگرآں راز کہ افشانی کرد

اور کچھ لوگ متحیرانہ انداز میں یوں گویا ہوتے ہیں ۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

حالانکہ سچائی یہ ہے کہ انہی دونوں کے تصور پر عمرانیات اور معاشرہ کی بنیاد کھڑی ہے، موت کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ زندوں اور مردوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتی ہے، اسی وجہ سے موت پر غم وافسوس، رنج وتکلیف ایک فطری جذبہ ہے، اور یہ جذبہ قدرت نے ہر انسان کو روز اول سے ودیعت کر دیا ہے، البتہ اہل ایمان کا اظہار غم کا طریقہ دیگر مذاہب واقوام سے مختلف ہے کیوں کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو کائنات اور اس سے ماورا کے متعلق جو ہدایت دیتا ہے وہ خالص اسلامی اور فطری نظریہ اور تصور ہے، وہ یہ کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک دوسری حیات کی ابتداء ہے۔'' (یادِ رفتگاں، سید سلیمان ندویؒ)

☆☆☆